www.alrisala.org

الرسالہ

Al-Risala

October 2007 • No. 371

وقت کے استعمال کا بجٹ بنائیے، جس طرح
آپ اپنی آمدنی اور خرچ کا بجٹ بناتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risala

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدّین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24356666, 24355454
Fax: 24357333
website: www.alrisala.org
email: skhan@vsnl.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10,
One year Rs. 100,
Two years Rs. 200,
Three years Rs. 250,
Abroad: One year $10 (Air Mail)

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

اکتوبر 2007

فہرست

پیغمبرِ انقلاب	2
دین اور منہاج	5
نسخ کیا ہے	12
اسلام کی سیاسی تعبیر کا فتنہ	16
جامع تصور یا تخریبی تصور	24
نظریاتی تشدّد	27
جہاد کیا ہے	28
عقیدہ اور سیاست	30
سیکولرازم کیا ہے	32
فتویٰ کا غلط استعمال	34
بدلتی ہوئی دنیا میں مسلمانوں کا لائحۂ عمل	37
نشانیوں سے سبق نہ لینا	42
مسلم مسلک کیا ہے	44

پیغمبرِ انقلاب

قرآن میں پچیس پیغمبروں کا ذِکر ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار تھی۔ نبوت کا یہ سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک ہر زمانے میں جاری رہا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ساتویں صدی عیسوی کے رُبعِ اوّل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا۔ قرآن کے مطابق، آپ خدا کے رسول بھی تھے اور نبیوں کے خاتم بھی۔

پیغمبروں کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تمام پیغمبر مشترک طور پر توحید کا پیغام لے کر آئے، لیکن پچھلے پیغمبروں کے زمانے میں یہ پیغام زیادہ تر فکری مرحلے میں رہا، وہ عملی انقلاب کے درجے تک نہیں پہنچا۔ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ ہوا کہ آپ کو اپنے اصحاب کی صورت میں ایک مضبوط ٹیم مل گئی۔ اِس طرح یہ ممکن ہو گیا کہ توحید کی دعوت کو فکری مرحلے سے آگے بڑھا کر عملی انقلاب کے درجے تک پہنچا دیا جائے۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے زمانے میں یہ انقلاب عملی طور پر پیش آیا اور پھر وہ تاریخِ بشری کا ایک معلوم اور مسلّم حصہ بن گیا۔

پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اتنی زیادہ واضح ہے کہ وہ صرف آپ کے پیروؤں کے ایک ''روایتی عقیدہ'' کی حیثیت نہیں رکھتی، بلکہ وہ ایک مسلمّہ تاریخی واقعہ ہے۔ پیغمبر آخر الزماں سے پہلے جو انبیا آئے، اُن کی زندگی مدوّن تاریخ کا جُز نہ بن سکی، مگر پیغمبر اسلام کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ آپ کی حیثیت ایک مسلّم تاریخی پیغمبر کی ہے، آپ کی نبوت پورے معنوں میں ایک ثابت شدہ نبوت ہے۔ انسانی زندگی کے جس پہلو کو بھی دیکھا جائے، اُس میں پیغمبر اسلام کی لائی ہوئی ابدی تعلیم کے اثرات نمایاں طور پر دکھائی دیں گے۔ وہ تمام بہترین روایات اور وہ تمام اعلیٰ قدریں جن کو آج اہمیت دی جاتی ہے، وہ سب پیغمبر اسلام کے لائے ہوئے عظیم انقلاب کے براہِ راست نتائج ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہہ تاریخ کے سب سے بڑے انسان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو انسانِ کامل بنا کر انسانی نسل پر اپنا سب سے بڑا احسان فرمایا ہے۔ خدا نے

پیغمبر آخر الزماں کی شکل میں تاریخ میں ایک ایسا بلند ترین مینار کھڑا کر دیا ہے کہ آدمی جس طرف بھی نظر اُٹھائے، وہ آپ کو دیکھ لے۔ جب وہ اپنے رہ نُما کی تلاش میں نکلے تو اُس کی نظر سب سے پہلے آپ پر پڑے۔ جب وہ حق کا راستہ جاننا چاہے تو آپ کا روشن اور بلند و بالا وجود اُس کو سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کر لے۔ آپ ساری انسانیت کے لیے ہادیٔ اعظم اور رہبرِ کامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِسی لیے خدا نے آپ کو نبیوں کے خاتم (الأحزاب: 40) کی حیثیت سے مبعوث فرمایا۔ دوسرے انبیا صرف اللہ کے رسول تھے، اور آپ اللہ کے رسول ہونے کے ساتھ خاتم النبیین بھی۔

میری کتاب 'پیغمبر انقلاب' پہلی بار 1982 میں چھپی۔ اس وقت میں نے اِس کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو الفاظ لکھے تھے، وہ نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی نشانِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآن کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو محمودیت کے مقام پر کھڑا کیا ہے (الإسراء: 79)۔ چناں چہ نہ صرف اہلِ اسلام بلکہ عام مصنفین اور مورخین نے آپ کی عظمت کو کھلے طور پر تسلیم کیا ہے۔

بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں مسلم قوموں اور مسیحی قوموں کے درمیان لڑائیاں پیش آئیں، جن کو صلیبی جنگ (crusades) کہا جاتا ہے۔ اِن جنگوں میں مسیحی قوموں کو شکست ہوئی۔ اُس کے بعد مسیحی مصنفین نے اسلام کے خلاف ایک قلمی جنگ چھیڑ دی۔ کثرت سے ایسی کتابیں لکھی گئیں جن میں اسلام اور پیغمبر اسلام کی تصویر کو بگاڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ یہ سلسلہ لمبی مدت تک جاری رہا۔

اِس سلسلے کو توڑنے والا پہلا قابلِ ذکر شخص اسکاٹ لینڈ کا ایک مصنف ٹامس کارلائل (وفات: 1881) ہے۔ اُس نے جرأت مندانہ طور پر اِس رجحان کو بدلا۔ اُس کی مشہور کتاب ہیرو ورشپ (On Heroes, Hero Worship) پہلی بار 1841 میں چھپی۔ اِس انگریزی کتاب میں اُس نے پیغمبر اسلام کی مثبت تصویر پیش کی۔ اُس نے پیغمبر اسلام کو دوسرے تمام پیغمبروں کے مقابلے میں ''ہیرو'' کا درجہ دیا۔

اِس کے بعد کثرت سے مختلف زبانوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کتابیں شائع ہوئیں۔ اِن کتابوں میں تاریخ میں آپ کے انقلابی رول کا کھلے طور پر اعتراف کیا گیا۔ مثلاً انڈیا کے ایک اسکالر ایم این رائے (وفات: 1954) کی کتاب (Historical Role of Islam) 1939 میں پہلی بار دہلی سے چھپی۔ اِس میں انھوں نے لکھا کہ پیغمبر اسلام، تمام پیغمبروں میں سب سے بڑے پیغمبر تھے۔ انھوں نے سب سے بڑا تاریخی معجزہ دکھایا:

Every prophet esptablishes his pretentions by the performance of miracles. On that token, Muhammad must be recognised as by far the greatest of all prophets, before or after him. The expansion of Islam is the most miraculous of all miracles. (p. 4)

پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قرآن میں یہ پیشین گوئی آئی ہے کہ آپ کو مقامِ محمود کا درجہ عطا کیا جائے گا (الإسراء: 79)۔ مقامِ محمودیت کا ایک پہلو وہ ہے جو آخرت میں ظاہر ہوگا۔ دوسرا پہلو وہ ہے جس کا تعلق، موجودہ دنیا سے ہے۔ موجودہ دنیا کی نسبت سے مقامِ محمود یہ ہے کہ آپ کو تاریخی اعتبار سے ایک مسلّم نبوت (established prophethood) کا درجہ حاصل ہوگا۔

آپ سے پہلے جو انبیا آئے، وہ مدوّن تاریخ میں ریکارڈ نہ ہو سکے۔ آپ کے سوا ہر ایک کی حیثیت، اعتقادی نبوت کی ہے نہ کہ تاریخی نبوت کی۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ آپ کو خدا نے آخری پیغمبر بنایا تھا۔ آپ کے بعد کوئی دوسرا پیغمبر آنے والا نہ تھا۔ اِس لیے ضروری تھا کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب اور آپ کی پیغمبرانہ زندگی کامل طور پر محفوظ ہو جائے، وہ تسلیم شدہ تاریخی ریکارڈ کی حیثیت حاصل کر لے۔ کیوں کہ قانونِ الٰہی کے مطابق، جب پیغمبر مستند تاریخی ریکارڈ کا درجہ حاصل کر لے تو اس کے بعد اُس کی لائی ہوئی کتاب اور اُس کی تعلیمات کا یہی ریکارڈ پیغمبر کا قائم مقام بن جاتا ہے، اِس کے بعد کسی نیے پیغمبر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

دین اور منہاج

قرآن کی سورہ نمبر 42 میں بتایا گیا ہے کہ خدا کا جو 'الدّین' ہے، اُس کو خدا نے تمام پیغمبروں کو یکساں طور پر دیا ہے (الشوریٰ: 13)۔ الدّین سے مراد، خدا کے دین کی ابدی تعلیمات ہیں۔ یہ تعلیمات ہمیشہ یکساں رہتی ہیں، اِس میں حالات یا زمانے کے تغیر سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دین کی یہ ابدی تعلیمات تمام پیغمبروں کو یکساں طور پر دی گئی ہیں۔ اِن ابدی تعلیمات کے اعتبار سے ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی فرق نہیں (لانفرّق بین أحدٍ من رّسُله، البقرة: 285)

دوسری طرف، قرآن کی سورہ نمبر پانچ میں بتایا گیا ہے کہ ہر پیغمبر کو خدا نے الگ الگ منہاج دیے: لكلٍّ جعلنا منكم شِرعةً ومنهاجاً (المائدة: 48)۔ اِس سے معلوم ہوا کہ دینِ خداوندی کے دو حصے ہیں۔ ایک، الدین اور دوسرا، منہاج۔ الدین ابدی طور پر ایک ہی رہتا ہے، لیکن منہاج یا طریقِ کار (method) کا تعلق وقت کے حالات سے ہوتا ہے، اِس لیے حالات کی تبدیلی کے تحت اُس میں فرق ہوتا رہتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی تھے (الأحزاب: 40) 570 عیسوی میں آپ مکہ میں پیدا ہوئے۔ 610 عیسوی میں آپ پر پہلی وحی اُتری۔ 632 عیسوی میں مدینہ میں آپ کی وفات ہوئی۔ آپ خدا کے آخری نبی تھے۔ آپ پر اُترنے والی کتاب (قرآن) کو خدا نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ آپ کو جو الدین دیا گیا، وہ کامل بھی ہے اور ابدی بھی ہے۔ ہر زمانے کے انسانوں کے لیے خدا کے دین کو جاننے کا یہی واحد مستند ماخذ ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا دوسرا حصہ وہ ہے، جس کا تعلق منہاج یا طریقِ کار سے ہے۔ اِس معاملے میں آپ نے رہ نما اصول مقرر فرما دیے ہیں، لیکن جہاں تک عملی طریقے کا تعلق ہے، وہ علماءِ امت کا کام ہے۔ ہر زمانے کے علماء حالات کے اعتبار سے اُس منہاج یا طریقِ کار کو اختیار کریں گے جو اُن کو حالات کے اعتبار سے موثر اور مفید نظر آئے۔

دین اور منہاج کا فرق

دوسرے پیغمبروں کی طرح، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دو چیزیں دی گئیں — الدین اور منہاج۔ الدین سے مراد آپ کی تعلیمات کا وہ حصہ ہے جس کا تعلق، عقیدہ اور عبادت اور اخلاق جیسی اساسی چیزوں سے ہے۔ آپ کی تعلیمات کا یہ حصہ ابدی ہے۔ وہ اِس طرح کامل ہو چکا ہے کہ اُس میں اب کسی کمی یا اضافے کی گنجائش نہیں۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کی سورہ نمبر پانچ میں اِن الفاظ میں کہی گئی ہے: **اليوم أكملتُ لكم دينكم وأتممتُ عليكم نعمتي، ورضيت لكم الإسلام ديناً (المائدة: 3)**

دین کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کو قرآن میں 'منہاج' کہا گیا ہے۔ اِس بارے میں قرآن کی سورہ نمبر پانچ کی اِس آیت سے رہ نمائی ملتی ہے: **لكلّ جعلنا منكم شرعةً ومنهاجا (المائدة: 48)** منہاج کا مطلب، طریقِ کار (method) ہے۔ طریقِ کار کا معاملہ ''الدین'' سے مختلف ہے۔ الدین، ابدی طور پر ایک ہی رہتا ہے، لیکن طریقِ کار کا تعلق حالات سے ہے۔ طریقِ کار، وقت کی صورتِ حال کی مناسبت سے بنتا ہے، نہ کہ کسی ابدی معیار کے تحت۔ پیغمبر اسلام کی زندگی میں اور اسلام کے بعد کی تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ الدین کے معاملے میں پیغمبر اسلام کا اُسوہ، ابدی طور پر اور غیر متغیر طور پر ایک ہے اور ایک رہے گا، لیکن جہاں تک منہاج کا معاملہ ہے، اُس کا تعلق حالات سے ہے۔ ہر زمانے میں جو طریقہ حالات کے مطابق ہوگا، اُس کو اختیار کیا جائے گا۔

چند مثالیں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب غزوۂ بدر (2 ہجری) کے لیے اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ سے کوچ فرمایا تو آپ نے اپنی صواب دید کے مطابق، ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ آپ کے ساتھیوں میں سے ایک ساتھی حبّاب بن مُنذر بن جموح نے آپ سے پوچھا کہ کیا یہ جگہ جہاں آپ نے پڑاؤ ڈالا ہے، یہ خدا کی وحی کی بنیاد پر ہے، آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر تو یہ کوئی پڑاؤ ڈالنے کی جگہ نہیں (**فإنّ هٰذا ليس بمنزل**)۔ اِس کے بعد آپ نے اُن کے مشورے کے مطابق، پڑاؤ کی جگہ کو بدل دیا۔

اِسی طرح کی ایک مثال وہ ہے جو غزوۂ اَحزاب (5 ہجری) کے موقع پر پیش آئی۔ اُس وقت آپ کے مخالفین ایک بڑی فوج لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اُس وقت اہلِ ایمان مقابلے کی پوزیشن میں نہ تھے، اِس لیے آپ نے چاہا کہ کسی تدبیر کے تحت جنگ کو ٹال دیا جائے۔ آپ نے لوگوں سے مشورہ کیا۔ اُس وقت سلمان فارسی کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ ایران کے بادشاہ جب جنگ سے اعراض کرنا چاہتے ہیں تو وہ اپنے اور مخالف فوج کے درمیان خندق (trench) کھود دیتے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس رائے کو پسند کیا اور ایرانی طریقے کے مطابق، مدینہ کے باہر ایک خندق کھود دی۔ اِس لیے اِس غزوے کو 'غزوۂ خندق' کہا جاتا ہے۔

اِسی طرح کا ایک معاملہ وہ ہے جو کھجور کے درختوں کی زرخیزی (pollination) سے تعلق رکھتا ہے۔ سیرت کی کتابوں میں اِس کو 'تأبیرِ نخل' کا نام دیا گیا ہے۔ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ آئے تو وہاں کے لوگ کھجور کے درختوں کی زرخیزی کے لیے تأبیرِ نخل کا طریقہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ آپ نے اُس کو دیکھا تو آپ نے اُس سے اپنے عدم اتّفاق کا اظہار کیا۔ چناں چہ لوگوں نے اُس کے بعد تأبیر یا تلقیح کے عمل کو چھوڑ دیا۔ مگر اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس سال کھجور کی فصل کم ہوئی۔ آپ نے کمی کا سبب پوچھا تو لوگوں نے کہا کہ آپ کے کہنے کے مطابق، ہم نے تأبیر اور تلقیح کا عمل نہیں کیا، اِس لیے ایسا ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ جو کرتے تھے، وہ کرو۔ کیوں کہ دنیا کے معاملے میں تم زیادہ جانتے ہو (أنتم أعلم بأمر دنياكم)۔

اِس قسم کے واقعات بتاتے ہیں کہ جہاں تک الدین کا تعلق ہے، اِس معاملے میں پیغمبر اسلام کا اسوہ ایک کامل اور ابدی اسوہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن جہاں تک منہاج یا طریقِ کار کا تعلق ہے، اِس میں حقیقی حالات کی نسبت سے یہ متعین ہوگا کہ کس وقت کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔

پیغمبر اسلام کا اُسوہ

اسلامی عقیدے کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم انسانی زندگی کے لیے ایک عملی نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ عملی نمونہ، زندگی کے ہر پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ

پیغمبر اسلام کی عملی زندگی ہر اعتبار سے، انسان کے لیے ابدی رہ نما کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہے کہ اُس نے پیغمبر آخر الزّماں کی زندگی کو آخری طور پر محفوظ کر دیا۔ ورنہ جہاں تک پچھلے پیغمبروں کا معاملہ ہے، ان کی تاریخ پورے طور پر محفوظ حالت میں موجود نہیں۔

لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے نمونہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کے یہاں انسانی زندگی کے ہر معاملے کے لیے ایک مقرر مثال (set pattern) یا ایک پیشگی نمونہ (prototype) موجود ہے اور ہمیں، حقیقی صورتِ حال کا لحاظ کیے بغیر، صرف یہ کرنا ہے کہ اِن پیشگی نمونوں کو لے کر ہمیشہ اُن کو اپنے ہر معاملے میں منطبق کرتے رہیں۔ اگر ایسا مانا جائے تو اسلام ایک جامد مذہب بن جائے گا، جس میں مزید ترقی کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ یہ بات پیغمبر اسلام کے زمانے کے لیے بھی درست ہے اور آپ کے بعد کے زمانے کے لیے بھی۔ اِس سلسلے میں چند مثالیں اوپر آ چکی ہیں۔ یہاں مزید کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

چند مزید مثالیں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں تھے تو اُس وقت کعبہ میں تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے، مگر آپ نے کبھی اُن بتوں کو توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ کیوں کہ اُس وقت کی صورتِ حال یہ تھی کہ مکہ میں مسلم اور غیر مسلم دونوں موجود تھے۔ لیکن ہجرت کے آٹھویں سال جب مکہ فتح ہوا تو مکہ کے تمام لوگ اسلام میں داخل ہو گیے۔ اُس وقت صورتِ حال مکمل طور پر بدل گئی۔ چناں چہ آپ نے تمام بتوں کو کعبہ سے نکال دیا۔ یہ دو مختلف طریقے آپ نے صورتِ حال کے فرق کی بنا پر اختیار فرمائے۔

ایک اور مثال یہ ہے کہ مدینہ میں آپ نے ایک خطاب میں فرمایا کہ: **نحن أمّةٌ أمّيّةٌ، لا نكتب ولا نَحسِب** (صحیح البخاری، مسلم، مسند احمد) یعنی ہم اُمّی لوگ ہیں۔ ہم نہ لکھتے ہیں اور نہ ہم حساب کرتے ہیں۔ یہ ابتدائی زمانے کی بات تھی۔ بعد کو ایرانی ایمپائر اور رومی ایمپائر اسلام کے علاقے میں داخل ہوئے تو صورتِ حال بدل گئی۔ اب بڑھی ہوئی ضرورتوں کی بنا پر سرکاری معاملات کا حساب رکھنا ضروری ہو گیا۔ چناں چہ خلیفۂ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسلامی سلطنت کے دفتروں کو ایرانی

ایمپائر اور رومی ایمپائر کے نمونے پر قائم کیا۔ انھوں نے ایرانیوں اور رومیوں کے ماہر افراد کو اسلامی دفاتر میں رکھا، جو ایرانی اور رومی نقشے پر سرکاری معاملات کا حساب درج کرتے تھے۔

طریقِ کار کے معاملے میں یہی عمل آپ کے بعد بھی جاری رہا۔ بنو اُمیّہ کے زمانے میں بحری بیڑا تیار کیا گیا، حالاں کہ اِس سے پہلے اسلام میں ایسا نہیں کیا گیا تھا۔ بنو عبّاس کے زمانے میں بغداد میں رسدگاہ (observatory) بنائی گئی، جو اسکندریہ کے رومی دَور میں بنائی جانے والی رسدگاہ کی نقل تھی۔ خوارزم شاہ کے زمانے میں سمرقند میں کاغذ کا کارخانہ بنایا گیا، جس کا نمونہ چین سے لیا گیا تھا۔ اَندلس کی مسلم حکومت کے زمانے میں آب پاشی کے نیے طریقے اختیار کیے گیے، جس کا نمونہ غیر مسلم قوموں سے لیا گیا تھا، وغیرہ۔

یہی معاملہ موجودہ زمانے کی تمام مسلم سرگرمیوں کا ہے۔ آج ہر معاملے میں قدیم طریقے کو چھوڑ کر جدید مغربی طریقہ اختیار کیا جارہا ہے۔ مثلاً فلسطین اور دوسرے مقامات پر مسلمان جو مسلّح جہاد کررہے ہیں اُس میں قدیم نمونے کے مطابق، تلوار اور گھوڑے کو جہاد کا ذریعہ نہیں بنایا گیا ہے، بلکہ گَن اور بم کو جہاد کا ذیعہ بنایا گیا ہے، وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ اسلام کا ایک حصہ وہ ہے جس کو قرآن میں ''الدین'' کہا گیا ہے۔ یہ اسلام کا وہ حصہ ہے جس کا تعلق، عقیدہ اور عبادت اور اخلاقی نظام جیسی اساسی چیزوں سے ہے۔ یہی اسلام کا اصل حصہ ہے، اور یہ حصہ ابدی طور پر ایک ہے اور ایک ہی رہے گا۔ یہ حصہ اُسی طرح انسان کی رہ نمائی کے لیے ابدی سرچشمہ ہے، جس طرح آفتاب ابدی طور پر روشنی کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔

مگر منہاج یا طریقِ کار کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ طریقِ کار کا تعلق وقت کے حالات سے ہوتا ہے۔ طریقِ کار کے معاملے میں ہمیشہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ حالات کے مطابق، کون سا طریقہ زیادہ مؤثر ہے اور پھر اُس کو اختیار کرلیا جاتا ہے۔

مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جب مکہ میں 610 عیسوی میں نبوت ملی تو آپ نے اُس وقت اعلان کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ آپ مکہ کے قریب صَفا پہاڑی پر کھڑے ہوئے اور وہاں سے لوگوں

کو بلند آواز سے پکارا۔ جب لوگ وہاں اکھٹا ہوئے تو آپ نے اُن کو توحید کا پیغام دیا۔ مگر آج کا ایک داعی اِس کے بجائے یہ کرتا ہے کہ وہ ٹیلی ویژن کے اسٹوڈیو میں بولتا ہے اور وہاں سے اُس کی آواز تمام انسانوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اِس مثال میں پیغامِ دعوت کا تعلق، دین سے ہے اور صَفا، یا ٹیلی ویژن کا تعلق، طریقِ کار سے۔

اُسوۂ حسنہ

اسلام کے انھیں دونوں حصوں میں فرق کو واضح کرنے کے لیے قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُسوۂ حسنہ (الأحزاب: 21) بتایا گیا ہے۔ اگر اس موقع پر قرآن میں 'اُسوۂ کاملہ' کا لفظ استعمال کیا جاتا تو لوگ غلط فہمی میں پڑ سکتے تھے، اور یہ سمجھ سکتے تھے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے الدّین میں آپ کے ذریعے انسان کو کامل رہ نمائی عطا فرمائی ہے، اُسی طرح منہاج کے معاملے میں بھی ابدی طور پر ہمیں آپ کے طریقے کی پیروی کرنا ہے۔ ایسا سمجھنا، بلاشبہہ ایک غلط فہمی ہوتی اور نتیجۃً طریقِ کار کے اعتبار سے اسلام جُمود کا شکار ہو جاتا۔

مثلاً طریقِ کار کو ابدی سمجھنے کے بعد یہ ہوتا کہ ہم کار اور ہوائی جہاز کے زمانے میں بھی اونٹ پر بیٹھنا ضروری سمجھتے۔ جدید فنی تعمیر کے ظہور میں آنے کے بعد بھی ہم مسجدِ نبوی کو کھجور کے تنوں اور پتّوں کے ذریعے بناتے رہتے۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ظہور کے بعد بھی ہم قرآن کو درخت کی چھالوں اور جانور کی جِھلّیوں پر بدستور لکھتے رہتے۔ جدید طرز کے دور مار ہتھیاروں کے ظہور میں آنے کے بعد بھی ہم قدیم نمونے کے مطابق، دستی تلوار کے ذریعے جہاد کرتے رہتے۔ جدید سائنسی دلائل کے ظہور میں آنے کے بعد بھی ہم قدیم روایتی معقولات کو اپنے علمِ کلام کا واحد سرمایہ سمجھتے۔ جدید کمیونی کیشن اور ٹیلی فون کے زمانے میں بھی ہم پرندوں اور جانوروں سے پیغام رسانی کا کام لیتے رہتے۔ جدید الیکٹری سٹی کے ظہور کے بعد بھی ہم چراغوں اور دِیوں کے ذریعے اپنے گھروں کو روشن کرتے رہتے۔ زرعی ٹریکٹروں کے ظہور میں آنے کے بھی ہم ہل اور بیل کے ذریعے زراعت کا کام جاری رکھتے، وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کی یہ ایک عظیم حکمت تھی کہ اُس نے قرآن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی رہ نمائی

کو بتانے کے لیے اُسوۂ حسنہ کا لفظ استعمال کیا۔ اگر اِس آیت میں اسوۂ کاملہ کا لفظ ہوتا تو لوگ یقینی طور پر غلط فہمی میں پڑ جاتے۔ لوگ الدین اور منہاج میں فرق کرنے سے قاصر رہتے۔ وہ غلط فہمی کی بنا پر یہ سمجھ لیتے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم، جس طرح الدین کے بارے میں ابدی اور کامل نمونہ ہیں، اِسی طرح منہاج اور طریقِ کار کے معاملے میں بھی آپ کا طریقہ ابدی ہے۔ اِس غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہوتا کہ اسلام جمود کا شکار ہو جاتا۔ دوسری قومیں جدید ترقیاتی طریقوں کو استعمال کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتیں اور مسلمانوں کا قافلہ اُن سے بہت زیادہ پیچھے ہو جاتا۔

اِس غلط فہمی اور اس کے غیر مطلوب نتائج کی ایک مثال تُرکی میں ملتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ عثمانی خلافت کا فوجی نظام، قدیم طرز کے مطابق چلا آ رہا تھا، یعنی اُن کی فوجی تیاری تلواروں اور گھوڑوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ پھر نشاۃِ ثانیہ کے بعد مغربی یورپ کی مسیحی قوموں نے سامانِ جنگ کے لیے نئی ٹکنک اور نیے ہتھیار دریافت کیے۔ اِس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ تُرکوں اور اِن مسیحی قوموں کے درمیان فوجی توازن بگڑ گیا۔ جدید ہتھیاروں سے مسلح مغربی فوجوں کے مقابلے میں ترکوں کی فوج شکست کھانے لگی۔ ترکی کے مسلمانوں کے لیے یہ ایک چشم کشا واقعہ تھا۔ چناں چہ بحث ومباحثے کے بعد یہ طے ہوا کہ ترکی کی فوج کو جدید ہتھیاروں کے ذریعے مسلح کیا جائے۔ چناں چہ وہاں ایسا ہی کیا گیا۔

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن بمبئی سے شائع ہو رہا ہے۔ ایڈیشن کا نام دی اسپریچول میسیج (The Spiritual Message) ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

دی اسپریچول میسیج، فی کاپی -/15 روپے، سالانہ -/165 روپے۔

خط وکتابت کا پتہ ہے:

The Spiritual Message
302, Koldongri CHS, Sahar Road
Andheri (East), Mumbai-400 099 (India)
Tel.: 2834 1654/ 28346079/ 2821 8609, Fax: 2823 6323
Email: hbshaikh@bom5.vsnl.net.in

نَسخ کیا ہے

قرآن کی تعلیمات میں سے ایک تعلیم وہ ہے جس کو نسخ کہا جاتا ہے۔ نسخ کا مطلب اُردو مفہوم کے لحاظ سے منسوخی نہیں ہے۔ عربی زبان میں نسخ کا مطلب ہے ہٹانا، یعنی ایک چیز کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسری چیز لانا (replacement)۔ مشہور عربی لغت، لسانُ العرب میں نسخ کا مفہوم اِن الفاظ میں بتایا گیا ہے: النَّسخ، تبديل الشيْ من الشيْ (جلد 3، صفحہ 61)، یعنی ایک چیز کو بدل کر اُس کی جگہ دوسری چیز لانا۔

نسخ کا یہ مفہوم خود قرآن کی دوسری آیت سے واضح ہو رہا ہے۔ قرآن کی سورہ نمبر 16 میں ارشاد ہوا ہے: وإذا بدّلنا آيةً مكانَ آية (النّحل: 101)، یعنی جب ہم بدلتے ہیں ایک آیت کی جگہ دوسری آیت۔ اِس آیت میں ایک چیز کو بدل کر اُس کی جگہ دوسری چیز لانے سے مراد عین وہی چیز ہے جس کو پہلی آیت میں نسخ کہا گیا ہے۔

مفسرین نے بھی دونوں آیتوں میں نسخ کا تقریباً یہی مفہوم لیا ہے۔ قرطبی کے الفاظ یہ ہیں: النّسخ والتّبديل: رفعُ الشّيْ مع وضع غيرهِ مكانه (القرطبی، جلد 10، صفحہ 176) یعنی نسخ اور تبدیلی کا مطلب کسی چیز کو اُس کی جگہ سے ہٹانا، اور وہاں دوسری چیز کو لے آنا ہے۔

نسخ کے معاملے کو عام طور پر یہود سے، یا یہود کی شریعت سے جوڑا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک قانونِ فطرت ہے۔ اِس قانون کا تعلق بہت سے معاملات سے ہے۔ جب بھی کسی صورتِ حال میں تبدیلی ہو تو وہاں نسخ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ نسخ جب بھی ہوتا ہے، ظاہری صورت میں ہوتا ہے، معنوی حقیقت کے اعتبار سے کسی حکم میں نسخ واقع نہیں ہوتا۔

چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم نے مکہ میں کعبہ کی تعمیر کی۔ یہ کعبہ حج کا مرکز تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو اِن الفاظ میں اس کا حکم دیا: اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔ وہ تمھارے پاس آئیں گے پَیروں پر چل کر اور دُبلے اونٹوں پر سوار ہو کر جو کہ دور دراز راستوں سے آئیں گے (الحج: 27)

موجودہ زمانے میں ہمیشہ سے زیادہ لوگ حج کے لیے مکہ جاتے ہیں، مگر اب یہ لوگ موٹر اور ہوائی جہاز سے اُس کا سفر کرتے ہیں۔ بظاہر دیکھیے تو یہ بھی نسخ کی ایک صورت ہے۔ اِس نسخ میں حقیقت نہیں بدلی ہے، بلکہ اس کی ظاہری صورت بدلی ہے۔ اِس معاملے کی اصل حقیقت سواری ہے۔ پہلے زمانے میں سواری کی عملی صورت اونٹ ہوتے تھے۔ اِس لیے لوگ اونٹ پر سفر کرتے تھے۔ اب سواری کی عملی صورت ہوائی جہاز ہے۔ اس لیے اب لوگ ہوائی جہاز کے ذریعے یہ سفر طے کرتے ہیں۔

اسی طرح دفاعی جنگ کی تیاری کے لیے قرآن میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ: اور اُن کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے، تیار رکھو قوّت اور پلے ہوئے گھوڑے کہ اِس سے تمھاری ہیبت رہے اللہ کے دشمنوں پر اور تمھارے دشمنوں پر (الأنفال: 60)

جیسا کہ معلوم ہے، موجودہ زمانے کی مسلم حکومتیں دفاعی تیّاری کے لیے جدید ہتھیار کا سہارا لیتی ہیں، یہ بھی گویا کہ نسخ کی ایک صورت ہے۔ غور کیجیے تو اِس حکم کی اصل حقیقت دفاعی تیاری ہے۔ اِس دفاعی تیاری کی ظاہری شکل پہلے زمانے میں گھوڑا ہوتا تھا، اب اُس کی ظاہری شکل مشینی ہتھیار بن گیے ہیں۔

یہی معاملہ قتال (جنگ) کا بھی ہے۔ قرآن کی چند آیتوں میں دفاع کے لیے قتال کی اجازت دی گئی ہے۔ فقہا نے کہا ہے کہ اسلام میں قتال حَسن لِذاتہ نہیں ہے، بلکہ وہ حسن لِغیرہ ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ قتال، نماز کی طرح مطلق طور پر مطلوب نہیں ہے بلکہ اُس کی مطلوبیت اضافی ہے، یعنی ضرورت کے وقت قتال، اور جب ضرورت نہیں تو قتال بھی نہیں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اور اصحابِ رسول کو قتال کا جو حکم دیا گیا تھا، اُس کا مقصد 'فتنة' کو ختم کرنا تھا۔ قرآن کی سورہ نمبر آٹھ میں ارشاد ہوا ہے: اور اُن سے لڑو، یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے۔ اور دین سب اللہ کا ہو جائے (الأنفال: 38) اِس آیت میں فتنہ سے مراد مذہبی جبر (religious persecution) ہے۔

قدیم بادشاہت کے نظام میں ہر جگہ یہ مذہبی جبر قائم تھا۔ بادشاہ لوگ اسٹیٹ کے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب کے اختیار کرنے کو اپنے خلاف بغاوت سمجھتے تھے، اِس لیے ایسے مذہب کو وہ ہمیشہ کچل دیتے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ساتویں صدی عیسوی کے رُبع اوّل میں ہوئی۔ اُس وقت قدیم بادشاہت کے تحت، ہر جگہ مذہبی جبر کا نظام قائم تھا۔ پیغمبر اسلام نے مذہبِ توحید کا اعلان کیا تو وہ اُس وقت کے تمام اَربابِ اقتدار کے اختیار کردہ مذہب کے خلاف تھا، اِس لیے وہ اس کو کچلنے کے لیے سرگرم ہوگیے۔

سب سے پہلے عرب مشرک سرداروں نے اُس کو ختم کرنا چاہا، لیکن خدا کی خصوصی نصرت سے چند مقابلوں کے بعد ان کے اوپر فتح حاصل ہوگئی۔ اِس طرح خود پیغمبر اسلام کے زمانے میں اُس وقت کے دو بڑے ایمپائر، ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر، آپ کے مشن کے دشمن بن گیے۔ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد خلافتِ راشدہ کے زمانے میں اِن شہنشاہیتوں کی جارحیت کے نتیجے میں اُن سے لڑائی پیش آئی۔ اِس لڑائی میں دوبارہ دونوں شہنشاہیتوں کو شکست ہوئی اور اہلِ توحید کو فتح حاصل ہوئی۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کو قرآن میں فتنہ کے خلاف لڑ کر اُس کو ختم کرنا بتایا گیا ہے۔ جب یہ نظامِ اقتدار ختم ہوا تو اس کے نتیجے میں مذہبی جبر کا نظام بھی ختم ہوگیا اور اس کے بجائے مذہبی آزادی کا نظام آ گیا۔ تاہم اِس قسم کی تبدیلی اچانک پیش نہیں آتی، بلکہ وہ لمبے تاریخی عمل کے بعد اپنی منزل تک پہنچتی ہے۔ رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے جو واقعہ ہوا، وہ یہ تھا کہ مذہبی جبر کا نظام ٹوٹ گیا اور مذہبی آزادی کا پراسس شروع ہوگیا۔ اِس پراسس کا نقطۂ انتہا (culmination) یورپ میں ہوا، جب کہ ہر انسان کے لیے مذہبی آزادی کو ناقابلِ تنسیخ حق کے طور پر تسلیم کرلیا گیا۔

اب ہم اِسی دور میں جی رہے ہیں۔ آج کی دنیا میں آزادی کو خیرِ اعلیٰ (summum bonum) سمجھا جاتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے ڈکلیریشن آف ہیومن رائٹس میں اس کو درج کیا گیا اور دنیا کی تمام قوموں نے اُس پر اپنے دستخط ثبت کیے۔ اور ہر ملک کے دستور میں مذہبی آزادی کو مطلق انسانی حق کا

درجہ دیا گیا۔ آج کی دنیا میں کسی انسان کو صرف تشدد کا حق نہیں ہے، اِس کے سوا ہر چیز کی آزادی اُس کو حاصل ہے۔

قتال کی حیثیت گویا کہ وائلنٹ ایکٹوزم (violent activism) کی ہے۔ اِس کے مقابلے میں دوسرا طریقِ کار وہ ہے جس کو پیس فُل ایکٹوزم (peaceful activism) کہا جاتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آج کی دنیا میں وائلنٹ ایکٹوزم منسوخ ہوگیا ہے اور اُس کی جگہ پیس فل ایکٹوزم نے لے لی ہے۔ اب پیس فل ایکٹوزم کے تحت ہر قسم کی سرگرمیوں کا حق انسان کو مل چکا ہے، صرف ایک استثنا کے ساتھ کہ وہ تشدد نہ کرے۔ اب ہمارے لیے بلا استثنا ہر قسم کی جدوجہد کے لیے راستے کھل چکے ہیں۔ اِن میں بھی سب سے بڑی چیز تعلیم اور دعوہ ورک ہے۔ ہم کو چاہیے کہ تعلیم اور دعوہ ورک کے میدان میں نیے مواقع کو استعمال کرتے ہوئے اپنی مکمل جدوجہد جاری کردیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج آزادی کے نتیجے میں یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ہم جدید مواقع کو استعمال کرتے ہوئے اپنا دعوہ ایمپائر اور ایجوکیشنل ایمپائر قائم کرسکیں۔ اور یہ سب کچھ خالص غیر سیاسی دائرے میں جدوجہد کرتے ہوئے ممکن ہے۔

ہندی ترجمہ قرآن

زیر نظر ترجمہ، ہندی زبان میں قرآن کا سلیس اور آسان ترجمہ ہے۔ عوام الناس کا خیال رکھتے ہوئے ہندی کے مشکل الفاظ سے اجتناب کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ عام فہم زبان میں ہونے کی بنا پر عوام اور خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔

ہدیہ: صرف -/25 روپے

اسلام کی سیاسی تعبیر کا فتنہ

پرنٹنگ پریس کا زمانہ آنے کے بعد مسلم دنیا میں کچھ انقلابی مفکرین اٹھے۔ یہ لوگ اسلام کی سیاسی حاکمیت قائم کرنے کے نام پر جہاد اور قتال کی پُر زور تبلیغ کرنے لگے۔ اب مسلم دنیا، اِس قسم کے انقلابی مفکرین کی تیسری نسل کو دیکھ رہی ہے۔ پہلی نسل کے مفکرین میں سید جمال الدین افغانی اور ڈاکٹر محمد اقبال کا نام لیا جاسکتا ہے۔ دوسری نسل کے مفکرین میں سید قطب اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نام شامل ہیں۔ تیسری نسل کے مفکرین میں اسامہ بن لادن اور ڈاکٹر اسرار احمد کے نام معروف ہیں۔

یہ انقلابی ذہن دراصل ایک طرف خلافتِ عثمانیہ کے زوال اور دوسری طرف مسلم دنیا کے بڑے حصے پر نوآبادیاتی نظام کے غلبے کا ردّعمل تھا۔ ابتدائی دور میں یہ لوگ صرف مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی واپسی پر زور دیتے تھے، پھر دھیرے دھیرے یہ ذہن ایک مکمل نظریے اور فلسفے کی روپ میں ابھرا۔ اب یہ کہا جانے لگا کہ — اسلام ایک مکمل نظام ہے (الإسلام دین شامل و کامل)، اِس لیے ضروری ہے کہ اسلام کو ایک کامل ریاست کے طور پر قائم کیا جائے، اِس کے بغیر اسلام ناقص رہے گا، اور ناقص اسلام ہمارے لیے دنیا میں بھی خسارے کا سبب ہے اور آخرت میں بھی خسارے کا سبب۔

واقعات بتاتے ہیں کہ اسلام کی سیاسی تعبیر کا ذہن تدریجی طور پر بنا۔ پہلی نسل کے مسلم رہ نماؤں کا نشانہ زیادہ تر زمین کی واپسی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم علاقوں پر مغربی قوموں نے غلبہ حاصل کرلیا ہے، اب ہمیں اِس غلبے کو ختم کرکے مسلم علاقے کو دوبارہ آزاد کرانا ہے۔ سید جمال الدین افغانی نے اِسی بات کو 'الشّرقُ للشّرقیین' کے الفاظ میں بیان کیا تھا، یعنی مشرق کے مسلم ممالک سے مغربی غلبے کو ختم کرکے دوبارہ اُس کو مشرق کے مسلمانوں کے قبضے میں دینا۔

بعد کو شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلم رہ نماؤں کے اندر یہ ذہن بنا کہ مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو وہ اپنا حامی بنا سکیں، چناں چہ عالمی اسلامی اتحاد (Pan-Islamism) کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے یہ کیا کہ سیاسی مسئلے کو اعتقادی مسئلے کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کردیا، یعنی انھوں

نے مسلمانوں کو یہ تاثّر دینا چاہا کہ اُن کی مہم صرف ایک قومی مہم نہیں ہے، بلکہ وہ خالص مذہبی مہم ہے۔ اِس طرح انھوں نے ایک سیاسی مسئلے کو اعتقادی مسئلہ بنا دیا۔ انھوں نے اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعے مسلمانوں کو یہ تاثر دینا شروع کیا کہ اسلام ایک مکمل نظام ہے، جس میں سیاست بھی لازماً شامل ہے۔ اگر مسلمان، اسلام کو ایک مکمل نظام کے طور پر غالب اور نافذ نہ کریں تو ان کا اسلام ہی ادھورا رہ جائے گا۔

اس مقصد کے لیے بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ اِن کتابوں میں اسلام کی تعبیر ایک مکمل نظامِ حیات کے طور پر کی گئی۔ اسلام کی سیاسی تعبیر کے طور پر جو لٹریچر تیار کیا گیا، اُن میں سے قرآن کی دو مکمل تفسیریں بھی تھیں۔ سید قطب کی چھ جلدوں میں عربی تفسیر ''في ظِلال القرآن'' اِسی فکر کے تحت لکھی گئی۔ اِسی طرح سید ابوالاعلیٰ مودودی کی چھ جلدوں میں لکھی جانے والی تفسیر ''تفہیم القرآن'' بھی خاص اِسی نظریے کے تحت تیار کی گئی۔ جو آدمی اِن دونوں تفسیروں کو پڑھتا ہے، اُس کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ اسلام ایک مکمل سیاسی نظام ہے اور اس کو زمین پر غالب اور نافذ کرنا، یہی امتِ مسلمہ کا اصل مشن ہے۔

اِن مسلم رہ نماؤں نے اپنے نقطۂ نظر کی بنا جن آیتوں اور حدیثوں پر رکھی، وہ سب کی سب بلاشبہہ بے بنیاد تھیں۔ ان کی یہ تشریحات یا تو تفسیر بالرائے ہیں، یا وہ تحریف کی نوع سے تعلق رکھتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اِن حضرات نے یہ کام غیر شعوری طور پر کیا ہو، لیکن جہاں تک اُن کے استدلال کی علمی حیثیت کا تعلق ہے، وہ بلاشبہہ مکمل طور پر غلط اور غیر اسلامی ہیں۔ یہاں ہم ان کے بعض دلائل کا تجزیہ کریں گے۔

چند مثالیں

1 - قرآن کی سورہ نمبر بارہ میں آیا ہے کہ حضرت یوسف نے جیل میں اپنے رفیق پر تبلیغ کرتے ہوئے کہا: **إن الحكم إلاّ للّٰه، أمر أن لاّ تعبدوا إلاّ إيّاه (يوسف: 40)** اِس آیت کو لے کر کہا جاتا ہے کہ یہاں 'حکم' سے مراد سیاسی اقتدار ہے، حضرت یوسف یہ کہہ رہے ہیں کہ سیاسی اقتدار صرف خدا کا حق ہے، اِس لیے خدا ہی کی حکومت زمین پر قائم ہونا چاہیے۔

یہ تفسیر بلاشبہہ ایک باطل تفسیر ہے۔ اِس آیت کا پورا سیاق بتا رہا ہے کہ یہاں حُکم سے مراد فوق الفطری اقتدار ہے، یعنی وہی بات جس کو قرآن میں دوسرے مقام پر ربّ العالمین کہا گیا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان کا خالق و مالک صرف خدا ہے، نہ کہ تمھارے مفروضہ معبود۔ اِس لیے تم کو چاہیے کہ تم اَصنام کی پوجا چھوڑ دو اور صرف ایک خدا کی عبادت کرو۔ خود حضرت یوسف کی عملی روش سے یہی بات ثابت ہوتی ہے، کیوں کہ حضرت یوسف نے مصر کے معاصر بادشاہ کے تحت ایک سرکاری عہدہ قبول کرلیا، حالاں کہ یہ بادشاہ مشرک تھا اور وہ اپنے قومی مذہب کے مطابق، اصنام پرستی میں مبتلا تھا۔

2- اِس معاملے میں ایک استدلال ایک صحابی کے قول کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ یہ صحابی رَبعی بنِ عامر تھے۔ وہ حضرت عمر کی خلافت کے زمانے میں مسلم فوج کے ساتھ ایران گیے، وہاں ان کی گفتگو ایرانی سپہ سالار رستم سے ہوئی۔ اُس نے پوچھا کہ تم لوگ کیوں ہمارے ملک میں آئے۔ ربعی بن عامر نے جواب دیا کہ ہم یہاں اِس لیے آئے ہیں تاکہ خدا کے بندوں کو بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا کی عبادت میں لائیں (لنُخرج مَن شاء مِنْ عبادة العبادِ إلى عبادة الله، تاریخِ طبری) صحابی کے اِس قول کو لے کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اسلام کا مشن 'تحریر الانسان' ہے، یعنی انسان کو انسانی جبر اور انسانی استحصال سے آزاد کرانا۔

یہ تشریح سرتاسر غیر علمی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اور اصحابِ رسول کو جو مشن سپرد کیا تھا، وہ ان کے زمانے ہی میں انجام پا گیا۔ اُس زمانے میں ساری دنیا میں بادشاہت کا نظام تھا اور بادشاہ لوگ اپنے سیاسی مفاد کے لیے مذہبی جبر (religious persecution) قائم کیے ہوئے تھے۔ یہ نظامِ جبر، خدا کے تخلیقی پلان کے خلاف تھا، اِس لیے خدا نے حکم دیا کہ اِس جبر کا خاتمہ کردو۔ چناں چہ پہلے عرب میں اِس کو ختم کیا گیا، اس کے بعد ایرانی شہنشاہیت اور رومی شہنشاہیت کا خاتمہ کرکے ایک ایسے دَور کا آغاز کیا گیا جس کے نتیجے میں ساری دنیا میں مذہبی جبر کے بجائے، مذہبی آزادی کا دَور دَورہ ہو۔

اِسی حقیقت کو صحابیِ رسول حضرت عبداللہ بن عمر نے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا: فعلنا علىٰ عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم (فتح الباری، جلد 8، صفحہ 32)، یعنی وہ تو ہم نے

عہدِ رسالت ہی میں آخری طور پر انجام دے دیا۔ اب اہلِ اسلام کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ مذہبی آزادی کے مواقع کو استعمال کر کے دعوت الی اللہ کا کام کریں، نہ کہ جھوٹی لڑائی چھیڑ کر دوبارہ دنیا میں جبر کا ماحول قائم کر دیں۔

3- ایک حدیثِ رسول، ابنِ ماجہ، الترمذی اور مسند احمد میں آئی ہے۔ اس کو مشکاۃ المصابیح میں حدیث نمبر 29 کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔ اِس روایت کے مطابق، ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ مجھے ایسا عمل بتایئے جو مجھ کو جنت میں داخل کر دے اور مجھ کو جہنم سے دور کر دے۔ اِس کے جواب میں آپ نے اُن کو عبادتِ خدا، روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ، ذِکر اللہ، صدقہ (انفاق) اور حفظِ لسان کی تلقین کی۔ آپ نے جو جواب دیا، اُس میں ایک جملہ یہ تھا: **وذِروَۃُ سَنامِہ الجهاد** (اور اُس کی چوٹی جہاد ہے)۔

'**وذروۃُ سَنامہ الجهاد**' کے جملے کو لے کر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں خیرِ اعلیٰ (summum bonum) گردن کٹانا ہے، یعنی جہاد اور قتال کر کے ساری دنیا میں اسلام کی حکومت قائم کرنا، اور خدا کی زمین پر خدا کے احکام نافذ کرنا۔

حدیث کی یہ تشریح سخت غیر علمی اور غیر منطقی ہے۔ اِس میں جہاد کا لفظ ہے، نہ کہ قتال کا لفظ۔ سیاق کے مطابق، یہاں جہاد سے مراد جہادِ نفس ہے، جیسا کہ دوسری حدیث میں آیا ہے: **المجاهد من جاهد نفسَه فی طاعة الله** (مسند احمد، جلد 6، صفحہ 21) بالفرض اگر اِس حدیث میں جہاد کو قتال کے معنیٰ میں لیا جائے، تب بھی وہ صرف بوقتِ جارحیت قتال کے معنی میں ہوگا، پھر بھی اِس سے یہ خود ساختہ مفہوم نہیں نکلتا کہ اسلام ایک مکمل نظام ہے اور اس کو لڑ کر ساری دنیا میں نافذ کرنا ہے۔

اسلام کی سیاسی تعبیر کے موضوع پر جو کچھ اُردو، یا عربی، یا انگریزی میں لکھا گیا ہے، اُس کا بڑا حصہ میں نے پڑھا ہے۔ ذاتی مطالعے کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ تعبیر کسی نص کی بنیاد پر قائم نہیں ہے، وہ صرف قیاس اور استنباط کی بنیاد پر قائم ہے۔ اور یہ ایک مسلّم بات ہے کہ اساسی امور میں منصوص استدلال

درکار ہوتا ہے، قیاسی اور استنباطی استدلال اِس طرح کے معاملے میں کبھی بناءِ استدلال نہیں بن سکتا۔

اِن حضرات کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ غلط استنباط کے ذریعے ایک سادہ آیت، یا حدیث میں سیاسی مفہوم شامل کر دیتے ہیں۔ مثلاً دین کو اسٹیٹ کے ہم معنیٰ بتانا، نماز یا جماعت کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ عسکری ٹریننگ ہے، روزے کو فوجی مشقت کی تربیت بتانا، وغیرہ۔ اِس قسم کا استدلال سخت غیر علمی استدلال ہے۔ اگر اِس قسم کے استدلال کو جائز استدلال قرار دیا جائے تو دنیا کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو قرآن اور حدیث سے ثابت نہ کی جا سکے، حتی کہ اِس قسم کے استنباطی استدلال کے ذریعے اسلام کو ایک منسوخ دین بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اِس سلسلے میں غیر علمی استدلال کی ایک اور قسم وہ ہے جس میں حرفِ عطف (واو) کی مدد سے بے بنیاد طور پر ایک غیر متعلق چیز کو اسلام کی کسی تعلیم میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً کچھ لوگوں نے اِسی طریقے کے مطابق یہ کہا کہ شرکِ اعتقادی اور شرکِ عملی کے ساتھ شرک کی ایک اور قسم ہے اور وہ شرکِ سیاسی ہے۔ **لا معبودَ إلاّ الله** کے ساتھ اُس کا ایک اور جز ہے اور وہ **لا حاکمَ إلا الله** ہے۔ اِسی طرح کہا گیا کہ عبادت کے لفظ میں پرستش کے سوا ایک اور مفہوم شامل ہے اور وہ اطاعت ہے، وغیرہ۔ مگر اِس قسم کے تمام اضافے بلاشبہہ بے حقیقت اور بے بنیاد ہیں۔

تعلیماتِ اسلام کے دو پہلو

مطالعہ بتاتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کے دو بڑے پہلو ہیں۔ قدیم اصطلاح میں اِن دونوں پہلوؤں کو 'حَسَن لذاتہ' اور 'حَسَن لِغیرہ' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی کچھ چیزیں وہ ہیں جو اپنے آپ میں مطلوب ہوتی ہیں، اور کچھ چیزیں وہ ہیں جو کسی اور چیز کی نسبت سے مطلوب ہوتی ہیں۔ اِس تقسیم کے مطابق، ذکر اللہ 'حسن لذاتہ' ہے اور قتال 'حسن لغیرہ'۔

اِس فرق کو دوسرے الفاظ میں اِس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں کچھ چیزیں وہ ہیں جو میٹر آف پرنسپل (matter of principle) کی حیثیت رکھتی ہیں، اور کچھ چیزیں وہ ہیں جن کی حیثیت میٹر آف کنوی نینس (matter of convenience) کی ہے۔ اِس تقسیم کے مطابق، سیاسی اقتدار کا

معاملہ دوسری نوعیت کے حکم سے تعلق رکھتا ہے۔

چناں چہ جہاں تک پہلی نوعیت کے احکام کا تعلق ہے، اُن کے بارے میں قرآن میں براہِ راست زبان میں احکام دیے گیے ہیں۔ مثلاً توحید کے بارے میں فرمایا کہ: **قل هو اللّٰه أحد** (الإخلاص: 1)، عبادت کے بارے میں فرمایا کہ: **لا إله إلّا أنا فاعبدنی** (طٰہٰ: 14)، عدل اور انصاف کے بارے میں فرمایا: **إنّ اللّٰه يأمركم بالعدل والإحسان** (النّحل: 95)، مگر جہاں تک سیاسی اقتدار کا تعلق ہے، اس کے بارے میں کہیں بھی اِس طرح براہِ راست حکم نہیں دیا گیا، یعنی کہیں بھی اِس طرح کے الفاظ نہیں آئے کہ تم لوگ اسلامی حکومت قائم کرو، یا زمین میں اسلامی قوانین کو نافذ کرو، یہی امت کی حیثیت سے تمھارا نصب العین ہے۔ اِس معاملے میں سیاست پسند افراد کی طرف سے جو دلائل دیے گیے ہیں، وہ سب کے سب قیاسی اور استنباطی ہیں، مگر اِس قسم کے اساسی معاملے میں مبنی بَرنص استدلال درکار ہے، نہ کہ مبنی بر قیاس استدلال۔

حاکم کا تقرر

تمام دنیا کے سیاسی نظاموں میں واضح طور پر یہ موجود رہتا ہے کہ حاکم کا تقرر کس طرح کیا جائے، مگر قرآن میں اِس معاملے میں کوئی واضح حکم موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی زمانے کے مثالی دَور میں جن خلفائے اسلام کا تقرر ہوا، اُن میں سے ہر ایک کا تقرر الگ الگ ڈھنگ سے ہوا، گویا کہ ان کا تقرر حالات کے مطابق ہوا، نہ کہ کسی مستقل اصول کے مطابق۔

اسلام کے دورِ اوّل کو ہر معاملے میں ایک معیاری دَور مانا جاتا ہے۔ اُس زمانے میں چھ خلفاء ایسے تھے جن کو اسلام میں مثالی حکم راں کا درجہ حاصل ہے — ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان بن عفّان، علی بنِ ابی طالب، معاویہ بن ابی سفیان، عمر بن عبدالعزیز۔ اِن میں سے ابتدائی پانچ خلفاء اصحابِ رسول میں شامل تھے۔ چھٹے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا شمار اجلّۂ تابعین میں سے ہوتا ہے۔ علماء نے بالاتفاق ان کو 'خلیفۂ راشد' کا درجہ دیا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اِن تمام خلفاء کا تقرر الگ الگ طریقے سے کیا گیا نہ کہ کسی ایک مقرر

طریقے کے مطابق، کیوں کہ اس معاملے میں کوئی ایک متعین طریقہ موجود ہی نہ تھا۔ یہ واقعہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ سیاسی اقتدار کا معاملہ اسلام میں نماز اور روزے کی طرح اصولی معاملہ نہیں ہے، اگر وہ اصولی معاملہ ہوتا تو توحید اور عبادت کی طرح اُس کے لیے بھی متعین احکام موجود ہوتے۔ یہ واقعہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اسلام میں سیاسی اقتدار کا معاملہ میٹر آف کنوی نینس (matter of convenience) کی قسم سے تعلق رکھتا ہے، وہ عقیدے اور اصول کا معاملہ نہیں۔

خیرِاعلیٰ: معرفتِ خداوندی

اسلام میں خیرِاعلیٰ (summum bonum) کا درجہ صرف ایک چیز کو حاصل ہے، اور وہ معرفت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معرفتِ خداوندی کے سوا، کسی اور چیز کو خیرِاعلیٰ کا درجہ دینا، خدا کی بھی تصغیر ہے اور خدا کے دین کی بھی تصغیر۔ جو لوگ سیاسی نظام کو خیرِاعلیٰ سمجھتے ہیں، ان کے بارے میں کم سے کم جو بات کہی جاسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے معرفتِ خداوندی کی عظمت کو دریافت نہیں کیا۔ اگر وہ معرفتِ خداوندی کی عظمتوں سے واقف ہوتے تو انھیں یہ بات سخت مضحکہ خیز معلوم ہوتی کہ معرفتِ خداوندی کے بجائے، ایک سیاسی نظام کو خیرِاعلیٰ کا درجہ دیا جائے۔

قرآن کی سورہ نمبر تین میں ارشاد ہوا ہے: کونوا ربّانیین (آل عمران: 79) یعنی تم لوگ ربّانی بنو۔ اِسی طرح قرآن میں ایسی آیتیں ہیں جن میں تلقین کی گئی ہے کہ تم لوگ ذاکرین بنو، تم لوگ خاشعین بنو، تم لوگ مخبتین بنو، تم لوگ عارفین بنو، تم لوگ خائفین بنو، تم لوگ متقین بنو، تم لوگ قانتین بنو، وغیرہ۔ یہ تصور سارے قرآن میں پھیلا ہوا ہے۔ ایک امریکی اسکالر نے اسلام کے گہرے مطالعے کے بعد ایک کتاب شائع کی ہے۔ اِس میں وہ بجا طور پر لکھتا ہے کہ:

The greatest concern of Islam is Allah.

اِس کے برعکس، قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اے اہلِ ایمان، تم لوگ سیاسی بنو، تم لوگ زمین کے حاکم بنو، اِس قسم کی بات قرآن میں کہیں بھی موجود نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن

کتابِ معرفت ہے، نہ کہ کتابِ سیاست۔ یہی بات قرآن کے موضوع کے مطابق ہے۔ قرآن کا موضوع خدائے برتر کا تعارف ہے۔ اور زمین و آسمان کے خالق و مالک کا تعارف جس کتاب میں بیان کیا جائے، اس کا سب سے زیادہ اہم موضوع بلاشبہہ معرفت ہوگا، نہ کہ سیاست۔

سیاسی تعبیر کا نقصان

اسلام کی سیاسی تعبیر کوئی سادہ بات نہیں، یہ خود اسلام کی نفی کے ہم معنی ہے۔ اِس قسم کی تعبیر فطری طور پر لوگوں کا ذہن سیاسی بنا دیتی ہے۔ سیاسی موضوعات ہی اُن کے لیے سب سے زیادہ اہم موضوعات بن جاتے ہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ معرفت ایک ایسا موضوع ہے جس کا نشانہ خود آدمی کا اپنا وجود ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کی توجہ ہمیشہ اپنی اصلاح پر لگی رہتی ہے، اپنی شخصیت کی تعمیر اور اپنے آپ کو خدا سے وابستہ کرنا، یہی اس کا سپریم کنسرن بن جاتا ہے۔

اِس کے مقابلے میں سیاست کا موضوع بالکل برعکس ذہن بناتا ہے۔ معرفت کی صورت میں سوچ کا نشانہ اگر داخلی تھا، تو سیاست کی صورت میں سوچ کا نشانہ خارجی بن جاتا ہے۔ مزید یہ کہ اِس خارجی نشانے کی حیثیت آدمی کے لیے حریف کی ہوتی ہے۔ آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اُس کی اصل کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنے سیاسی مدِّ مقابل کو شکست دے اور اُس کے اوپر غلبہ حاصل کرے۔

معرفت کا نشانہ آدمی کے باطن کو خدا کی روشنی سے بھر دیتا ہے، اس کے اندر ہر قسم کی مثبت صفات پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اِس کے برعکس، سیاست کا نشانہ آدمی کے باطن کو ظلمات سے بھر دیتا ہے۔ اُس کا وجود ہر قسم کی منفی نفسیات کا جنگل بن جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر آدمی کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ بظاہر 'مکمل اسلام' کی بولی بولتا ہے، لیکن عملاً اس کا وجود 'جزئی اسلام' سے بھی خالی ہو کر رہ جاتا ہے۔

جامع تصور یا تخریبی تصور

کچھ لوگ اسلام کا جامع تصور پیش کررہے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ — اسلام ایک مکمل نظام ہے۔ اسلام میں صرف عقیدہ اور عبادت اور اخلاق شامل نہیں ہیں، بلکہ پولٹکل سسٹم بھی اس کا لازمی جز ہے۔ پولٹکل سسٹم کو قائم کیے بغیر اسلام ادھورا رہتا ہے، وہ مکمل نہیں ہوتا۔ یہ بظاہر اسلام کا جامع تصور ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف ایک تخریبی تصور ہے۔ موجودہ زمانے کی مسلم ملیٹنسی (Muslim militancy) اِسی نام نہاد جامع تصور کی براہِ راست پیداوار ہے۔

آپ اسلام کے عقیدے کو مانیں، اسلامی طریقے پر عبادت کریں، اسلام کے اخلاقی اصولوں کی پابندی کریں تو یہ آپ کا ایک ذاتی عمل ہوتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے کسی اور کے ساتھ آپ کا ٹکراؤ پیش نہیں آتا، لیکن جب آپ اپنا نشانہ یہ بنائیں کہ مجھے زمین پر اسلامی حکومت قائم کرنا ہے تو یہ نشانہ فوراً آپ کو دوسرے سے ٹکرا دیتا ہے۔ اس لیے کہ پولٹکل اقتدار کوئی خالی سیٹ نہیں ہے جس پر جا کر آپ بیٹھ جائیں۔ پولٹکل اقتدار ہمیشہ کسی کے قبضے میں ہوتا ہے، اِس لیے پولٹکل گدّی کو حاصل کرنے کے لیے فوراً دوسروں سے ٹکراؤ پیش آتا ہے۔ اِس طرح آپ کا نشانہ آپ کے اندر یہ ذہن پیدا کرتا ہے کہ آپ اقدام کرکے قابض لوگوں سے اقتدار کی کنجیاں چھین لیں۔ اقتدار کی کنجیوں کو چھیننے کا یہ نظریہ قدرتی طور پر دو گروہوں کے درمیان تشدد اور ٹکراؤ کی صورت پیدا کردیتا ہے۔

پھر یہ بات اتنی سادہ نہیں۔ جب آپ یہ دیکھتے ہیں کہ اقتدار کی کنجیوں کو چھیننے کی کوشش میں آپ ایسا نہیں کرسکے کہ اربابِ اقتدار کو ان کی گدیوں سے ہٹا دیں، کیوں کہ اربابِ اقتدار کے پاس پولیس اور فوج کی طاقت ہوتی ہے، آپ اِس پوزیشن میں نہیں ہوتے کہ اُن سے براہِ راست ٹکراؤ کرکے سیاسی ادارے پر قبضہ کرلیں، چناں چہ آپ اپنے اِس اقدام میں ناکام رہتے ہیں۔

اقتدار کی کنجیوں کو چھیننے کا یہ ناکام تجربہ آپ کے اندر ایک اور برائی پیدا کرتا ہے۔ اب آپ معصوم عوام پر گولیاں چلاتے ہیں، ہوائی جہاز کی ہائی جیکنگ کرتے ہیں، اسکول اور بازار میں بم مارتے

ہیں۔ اِس منفی کارروائی کی آخری حد یہ ہوتی ہے کہ آپ خودکُش بم باری (suicide bombing) شروع کردیتے ہیں۔ اقتدار کی کنجیوں کو چھیننے کا جو اقدام دوسروں کے خلاف تشدد سے شروع ہوا تھا، وہ خود اپنے آپ کو ہلاک کرنے تک پہنچ جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں مختلف مقامات پر جو مسلم ملیٹنسی جاری ہے، وہ براہِ راست طور پر اِسلام کے اِسی نام نہاد جامع تصور کا نتیجہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اصلاً اپنے آپ کو خدا کے احکام کا پابند بنانے کا نام ہے۔ جہاں تک اجتماعی نظام میں اسلام کے سیاسی اور قانونی احکام کے نفاذ کا سوال ہے، وہ تمام تر حالات پر منحصر ہے۔ سماج اگر اِن احکام کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو تو پُر امن کوششوں کے ذریعے اِن احکام کی بجا آوری کی جائے گی، ورنہ نہیں۔ اسلام کا اصول، تکلیف بقدرِ وسعت (البقرة: 286) کا اصول ہے۔ اجتماعی احکام کے نفاذ کے لیے اجتماعی ارادہ (social will) درکار ہے۔ گن اور بم کی طاقت سے یہ کام کبھی انجام نہیں پاسکتا۔ گن اور بم کا طریقہ صرف تباہ کن تشدد پیدا کرتا ہے، اِس منفی انجام کے سوا اس کا کوئی اور انجام نہیں۔

جامع تصور کی غلطی کو واضح کرنے کے لیے یہاں میں ایک مثال دوں گا۔ چیزیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک، مکان اور دوسرے، درخت۔ اگر آپ مکان کا ایک جامع تصور دیں اور یہ کہیں کہ جامع مکان وہ ہے جس میں برآمدہ ہو، بیڈروم ہو، ملاقات کا کمرہ ہو، کچن ہو، باتھ روم ہو، وغیرہ، تو مکان کے بارے میں آپ کا یہ بیان درست ہوگا، کیوں کہ مکان مختلف الگ الگ اجزا کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جس مکان میں اس کا ہر جز موجود ہو، اس کو ایک جامع مکان کہا جائے گا۔

لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ درخت کا جامع تصور یہ ہے کہ اس کے اندر جڑیں ہوں، تنا ہو، شاخیں ہوں، پتیاں ہوں، پھل اور پھول ہوں، تو یہ ایک غلط بات ہوگی، کیوں کہ درخت مختلف الگ الگ اجزا کو ملا کر نہیں بنتا، بلکہ وہ ایک بیج کے نشو ونُما (growth) سے وجود میں آتا ہے۔ اِس لیے درخت کے بارے میں جامع تصور نہیں پیش کیا جائے گا، بلکہ سارا زور اس پر دیا جائے گا کہ اس کا بیج ایک صحت مند بیج ہو، کیوں کہ صحت مند بیج کے ظہور ہی کا دوسرا نام درخت ہے۔

اسلام کی مثال درخت کی مانند ہے۔ چناں چہ قرآن میں ایمان اور اسلام کی مثال شجرۂ طیّبہ (إبراهيم: 24) سے دی گئی ہے۔ جس طرح درخت ایک بیج سے ترقی کرکے درخت بنتا ہے، اِسی طرح اسلام ایک کلمہ سے ترقی کرکے پورا وجود بنتا ہے۔ اسلام کے بارے میں صحیح تشریح یہ ہے کہ اُس کو حقیقی تصور کی اصطلاح میں بیان کیا جائے، نہ کہ جامع تصور کی اصطلاح میں۔

درخت کی اصلاح کے لیے اگر کوئی شخص ایسا کرے کہ اُس کی پتیوں کو کاٹے، اُس کی شاخوں پر محنت کرے، اُس کے تنے پر زور آزمائی کرے تو اِس قسم کی تمام چیزیں درخت میں کوئی اصلاح یا ترقی نہیں لائیں گی، بلکہ وہ درخت کی تباہی کا ذریعہ بنیں گی۔ اِس قسم کی کوششوں کے نتیجے میں درخت مزید شاداب نہیں ہوگا، بلکہ وہ سوکھ کر رہ جائے گا۔

یہی معاملہ دین کا ہے۔ دین کی اصل، تعلق باللہ ہے۔ اِسی کے ساتھ دین کے بہت سے ظواہر ہیں۔ اگر کوئی شخص ظواہر کو اہمیت دے کر اُس میں محنت کرے، یا پُرتشدد جدوجہد کرے تو اِس سے دین میں کوئی بہتری نہیں آئے گی، بلکہ دین کا معاملہ کچھ اور بگڑ جائے گا، حتیٰ کہ اگر اچھی نیت اور اخلاص کے ساتھ ایسا کیا جائے تب بھی دین یا اہلِ دین میں کوئی حقیقی اصلاح آنے والی نہیں۔

دین یا اہلِ دین میں ترقی کا کام یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندر حقیقی معنوں میں تعلق باللہ پیدا کیا جائے۔ لوگوں کے اندر ربّانی شعور کو جگایا جائے۔ لوگوں کو خدا کی پکڑ سے ڈرنے والا بنایا جائے۔ یہی وہ چیز ہے جو دین یا اہلِ دین کے اندر حقیقی معنوں میں کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرے گی۔ اِس بنیادی کام کے بغیر ہرگز مطلوب نتیجہ نکلنے والا نہیں۔

نظریاتی تشدّد

تشدد ایک جذباتی عمل ہے۔ یہ بُرائی ہمیشہ انسانی زندگی میں پائی جاتی رہی ہے، مگر کمیونسٹ مفکر کارل مارکس (وفات: 1883) پہلا شخص تھا جس نے تشدد کو ایک باقاعدہ نظریہ بنایا۔ کارل مارکس نے اپنے اِس نظریاتی تشدد کو تاریخی ناگُزیریت (historical determinism) قرار دیا اور اُس کو جَدلیاتی مادّیت (dilectical materialism) کا نام دیا۔

موجودہ زمانے میں کچھ مسلم مفکرین پیدا ہوئے، جنھوں نے اِس نظریاتی تشدد کو اسلامائز کیا اور اُس کو جہاد کے نام سے اسلام میں داخل کر دیا۔ اِس معاملے میں وہ اِس انتہا تک گیے کہ انھوں نے کہا کہ باطل سے اقتدار کی کنجیوں کو چھیننے کے لیے ہتھیار کا استعمال ضروری ہے، اور یہ کہ گردن کٹانا، اسلام میں خیرِ اعلیٰ (summum bonum) کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ متشددانہ فلسفہ اتنا لغو ہے کہ وہ اسلام جیسے مذہب کے لیے ازالۂ حیثیتِ عُرفی کا درجہ رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاد پُر امن جدوجہد کا نام ہے۔ جہاد کے نام پر تشدد کرنا بلاشبہہ فساد ہے، نہ کہ جہاد۔

تشدد ایک منفی کارروائی ہے اور منفی کارروائی کے ذریعے کوئی مثبت نتیجہ کبھی نہیں نکلتا۔ چناں چہ موجودہ زمانے میں مسلم ملکوں میں یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ اِس نظریے کے حاملین نے پہلے خود ساختہ طور پر ''باطل'' کو ہٹانے کے نام پر متشددانہ جہاد کیا اور جب قانونِ فطرت کے مطابق، اُن کا مفروضہ باطل نظام نہیں ہٹا تو اِس کے بعد وہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف تشدد کرنے لگے۔ گویا کہ اُن کا وہ حال ہوا جس کی پیشین گوئی حدیث میں اِن الفاظ میں کی گئی تھی: **لا ترجعوا بَعدی کُفّاراً، یضرب بعضکم رقابَ بعض۔ (صحیح البخاری، کتاب المغازی)**

مسلمانوں کے متشددانہ جہاد کا یہ آخری انجام کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو مارنے لگیں، یہ اپنے آپ میں اِس بات کا ثبوت ہے کہ اُن کا جہاد جہاد نہ تھا، بلکہ وہ جہاد کے نام پر فساد تھا۔ ورنہ اُس کا یہ الٹا نتیجہ کبھی نہ نکلتا۔

جہاد کیا ہے

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ سے واپس ہو کر مدینہ پہنچے تو آپ نے فرمایا: **رجعنا من الجهاد الأصغر إلى الجهاد الأكبر** (ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آئے ہیں) اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ ہم وقتی جہاد سے مستقل جہاد کی طرف واپس آئے ہیں:

We have come back from temporary jihad to permanent jihad.

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وقتی جہاد سے مراد دفاعی جہاد (defensive jihad) ہے، جو کبھی کبھی پیش آتا ہے، اور مستقل جہاد سے مراد اسپرچول جہاد (spiritual jihad) ہے، جو ہر آدمی کی زندگی میں مستقل طور پر جاری رہتا ہے۔ اِس بات کو ایک اور حدیث میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: **جاهدوا أهوائكم كما تجاهدون أعدائكم**۔ یعنی اپنی خواہشات سے جہاد کرو، جس طرح تم اپنے دشمن سے جہاد کرتے ہو۔

دشمن کے خلاف جہاد انتہائی وقتی چیز ہے، جو اُس وقت پیش آتا ہے جب کہ کسی نے باقاعدہ طور پر ریاست کے اوپر حملہ کر دیا ہو۔ یہ دفاعی جہاد ہے، اور اِس میں صرف کچھ تربیت یافتہ افراد حصہ لیتے ہیں، نہ کہ ساری مسلم کمیونٹی۔ اِس کے برعکس، اپنے نفس کے خلاف جہاد ایک انفرادی نوعیت کی چیز ہے اور وہ ہر مومن کی زندگی میں جاری رہتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اِس لیے اس دنیا میں ہر عمل کو کرنے کے لیے اپنے نفس کے ساتھ مقابلہ پیش آتا ہے۔ اپنے نفس سے کامیاب مقابلے کے بغیر کوئی آدمی جہادِ نفس کے کام کو انجام نہیں دے سکتا۔ مثال کے طور پر یہ ایک ثواب کا کام ہے کہ آپ جب کسی شخص سے ملیں تو کہیں 'السلام علیکم' (تمھارے اوپر سلامتی ہو)۔ یہ کلمہ اتنا بڑا عمل ہے کہ اِس کے کہنے پر حدیث میں جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں جب آدمی لوگوں کے ساتھ رہتا ہے تو بار بار اُس کو

دوسروں کی طرف سے تلخ تجربات پیش آتے ہیں۔ اِس بنا پر ہر آدمی کے دل میں دوسروں کے خلاف شکایت کے جذبات موجود رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں حقیقی معنوں میں 'السلام علیکم' صرف وہ شخص کہہ سکتا ہے جو اس سے پہلے اپنے دل کو ہر قسم کے منفی جذبات سے پاک کرے اور اس کے بجائے اپنے دل کو لوگوں کے لیے خیر خواہی کے جذبات سے بھر دے۔ غور کیجئے تو یہ کام اتنا مشکل ہے کہ اِس کے لیے وہی زبردست کوشش کرنی پڑے گی جس کو جہاد کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اِسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ: الحمد للّٰہ تملأ المیزان (الحمدللہ کا کلمہ میزان کو بھر دیتا ہے) غور کیجئے تو یہ بھی کوئی سادہ بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سچا الحمدللہ کہنے کے لیے بہت بڑا ذہنی عمل درکار ہے۔ الحمدللہ کہنا، خدا کی نعمتوں پر شکر کا اظہار کرنا ہے۔ خدا کی یہ نعمتیں آدمی کو مسلسل طور پر لاتعداد صورتوں میں ملتی رہتی ہیں۔ یہ نعمتیں ہر آدمی کو اپنے آپ ملتی ہیں۔ چناں چہ آدمی ان کا عادی ہو جاتا ہے اور عادی ہونے کی بنا پر شعوری طور پر ان کو بطور نعمت محسوس نہیں کرتا۔ ایسی حالت میں الحمدللہ کہنے کے لیے ایک فکری جہاد کرنا پڑتا ہے۔ اُس کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی تفکیری قوتوں کو عمل میں لا کر غیر شعور کو اپنے شعور میں لائے، اپنے جذبات کی نئی رُخ بندی کرے، وہ اپنی فکری قوتوں کو بیدار کرنے کے لیے مجاہد بن جائے۔ اِس کے بعد ہی اس کی زبان سے وہ کلمۂ حمد نکلتا ہے جو میزان کو بھر دینے والا کلمہ ہے۔

آدمی کے اندر طرح طرح کی خواہشیں ہیں — حرص، علو پسندی، دوسرے کو حقیر سمجھنا، بے صبری، غصہ اور انتقام، وغیرہ۔ آدمی ہر وقت اِن منفی جذبات کے تابع رہتا ہے۔ اِسی کے ساتھ وہ کچھ چیزوں کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے۔ مثلاً دولت، شہرت اور اولاد، وغیرہ۔ آدمی کی یہ بے پناہ خواہش ہوتی ہے کہ یہ تمام چیزیں اس کو بھرپور طور پر حاصل ہو جائیں۔

نفرت اور محبت کے یہ مختلف جذبات، آدمی کے اوپر ہر وقت چھائے رہتے ہیں، وہ جو کچھ سوچتا ہے، اِنھیں جذبات سے مغلوب ہو کر سوچتا ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر انھیں جذبات کے تحت اپنی زندگی کا نقشہ بناتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ بلاشبہہ ایک جہادی عمل ہے کہ آدمی خدا کو مسلسل طور پر اپنا مرکزِ توجہ بنائے، وہ صراطِ مستقیم سے اپنے آپ کو ہٹنے نہ دے — یہی وہ پُرمشقت عمل ہے جس کو حدیث میں جہادِ نفس کہا گیا ہے۔

عقیدہ اور سیاست

دینِ اسلام کے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق ابدی عقیدے سے ہے، اور دوسرا حصہ وہ ہے جو حالات کے تابع ہوتا ہے، اس لیے اس میں تغیر ہوسکتا ہے۔ پہلا حصہ حقیقی (real) ہے، اور دوسرا حصہ اضافی (relative)۔ پہلے حصے کو میٹر آف بلیف (matter of belief) کہیں گے، اور دوسرے حصے کو میٹر آف کنوی نینس (matter of convenience) کہیں گے۔

عقیدے سے مراد، توحید اور رسالت اور آخرت کا عقیدہ ہے، عبادت بھی اِسی میں شامل ہے۔ میٹر آف کنوی نینس میں جو چیزیں شامل ہیں، اُن میں سے ایک سیاست اور حکومت ہے۔ عقیدہ اور عبادت میں ابدیت (eternity) ہے، ان کی مطلوبیت دائمی ہے۔ لیکن سیاست اور حکومت کا معاملہ اُس سے الگ ہے۔ جیسے حالات ہوں گے اُسی کے مطابق، سیاست اور حکومت کے معاملات بھی ہوں گے۔

اسلام میں سیاست کو عقیدے کا مسئلہ نہیں بنایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں قائم شدہ حکومت کے خلاف خروج (revolt) کرنا حرام ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جب ایک حکومت قائم ہو جائے تو اُس کے خلاف ہرگز باغیانہ کارروائی نہ کی جائے، بلکہ اس کے ساتھ معتدل تعلقات قائم رکھتے ہوئے غیر سیاسی دائروں میں کام کیا جائے، مثلاً دعوت، تعلیم اور اصلاحی کام، وغیرہ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں خلیفہ کے تقرر کا کوئی متعین اصول موجود نہیں۔ اِس معاملے میں قرآن میں کوئی ہدایت نہیں دی گئی۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ کو معیاری زمانہ مانا جاتا ہے۔ اِس زمانے میں چھ برحق خلیفہ، یا حکم راں ہوئے — ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان بن عفّان، علی ابن ابی طالب، معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم اور عمر بن عبد العزیزؒ۔

جیسا کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، اِن میں سے ہر خلیفہ یا حکم راں کا تقرر الگ الگ ڈھنگ سے کیا گیا۔ یہ واضح طور پر اِس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام میں سیاسی ادارے کے متعلق کوئی متعین نقشہ

موجود نہیں۔ حالاں کہ ہر سیاسی دستور میں اس کا واضح ڈھانچہ موجود ہوتا ہے۔

اِس صورت حال کا سبب یہ ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا کنسرن خدا ہے۔ اسلام کے نزدیک سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسان خدا کی معرفت حاصل کرے۔ وہ خدا کا سچا عبادت گزار بنے۔ وہ اعلیٰ اخلاق کے ساتھ لوگوں کے درمیان رہے۔ اِسی کے ساتھ وہ لوگوں کو خدا کے دین کی طرف بلائے۔ وہ خالص غیر سیاسی انداز میں اسلام کا داعی بن جائے۔ وہ اصلاح اور تعلیم کے دائرے میں لوگوں کی خدمت کرے۔

سیاسی اقتدار کا قیام اسلام کا نشانہ نہیں۔ قرآن کے مطابق، سیاسی اقتدار کی حیثیت پرچۂ امتحان کی ہے، اُس کا معاملہ مال جیسا ہے۔ مال انسان کے لیے امتحان کا پرچہ ہے، اس لیے مال کبھی ایک انسان کے پاس ہوتا ہے اور کبھی دوسرے انسان کے پاس۔ کیوں کہ خدا کو ہر انسان کا ٹیسٹ لینا ہے۔ اگر مال و دولت کو ابدی طور پر کسی ایک فرد یا گروہ کا حصہ بنا دیا جائے تو مال کی نسبت سے دوسرے لوگوں کی آزمائش نہ ہو سکے گی، حالاں کہ ایسا ہونا خدا کے تخلیقی پلان کے خلاف ہے۔

یہی معاملہ سیاسی اقتدار کا ہے۔ سیاسی اقتدار بھی امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ سیاسی اقتدار کسی کو اِس لیے دیا جاتا ہے کہ اُس کو آزما کر دیکھا جائے کہ وہ اقتدار پا کر کیسا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی اقتدار کسی ایک فرد یا گروہ کے ہاتھ میں نہیں رہتا، بلکہ وہ مختلف لوگوں کے درمیان گردش کرتا رہتا ہے۔ اِس اصول کو قرآن میں اِن الفاظ میں بتایا گیا ہے: **تلک الأیّام نداولها بین الناس** (آل عمران: 140)

اسلام میں سیاسی اقتدار کا مطلق طور پر مطلوب نہ ہونا کوئی کمی کی بات نہیں، یہ انسانی فلاح کے لیے بے حد اہم اصول ہے۔ انسانوں کے درمیان تمام بڑے بڑے جھگڑے سیاسی اقتدار کو لے کر ہوتے ہیں۔ اِس لیے سیاسی اقتدار کے معاملے میں اسلام نے اسٹیٹس کوازم (statusquoism) کا اصول اختیار کیا ہے۔ اِس اصول کا فائدہ یہ ہے کہ سماج میں امن قائم رہتا ہے۔ لوگ جنگ اور تشدد سے بچ کر اصلاح اور تعمیر کے کام میں زیادہ سے زیادہ مشغول رہتے ہیں۔ اِس بات کو دوسرے لفظوں میں اِس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں بالواسطہ سیاست ہے، نہ براہِ راست سیاست۔

سیکولرازم کیا ہے

سیکولرازم کے بارے میں منصفانہ رائے قائم کرنے کے لیے دو چیزوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ایک ہے سیکولر فلاسفی، اور دوسری چیز ہے سیکولر پالیسی۔ دونوں کے درمیان واضح فرق ہے۔ جولوگ اِس فرق کو نہ سمجھیں، وہ سیکولرازم کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔

سیکولر فلاسفی ابتداءً اُن لوگوں کے ذہن کی پیداوار تھی جو ملحدانہ سوچ کا شکار تھے۔ مگر بعد کو فلسفے سے الگ ہوکر سیکولرازم، جمہوری نظام کی عملی پالیسی بن گیا۔ عملی پالیسی کی حیثیت سے اُس کا مطلب یہ تھا کہ — مذہبی اُمور کو لوگوں کی انفرادی آزادی کا معاملہ قرار دے دینا، اور مشترک مادّی مفادات کو اسٹیٹ کے دائرے کی چیز سمجھنا۔

قدیم زمانہ مذہبی جبر کا زمانہ تھا۔ موجودہ زمانے میں مذہبی آزادی کو لوگوں کا ایک ناقابلِ تنسیخ حق قرار دے دیا گیا ہے۔ سیکولر پالیسی دراصل لوگوں کی اِسی مذہبی آزادی کا ایک حصہ ہے۔ پہلے زمانے میں یہ طریقہ تھا کہ ایک مذہبی گروہ دوسرے مذہبی گروہ کو آزادی دینے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ وہ ان کو مذہبی تعذیب (religious persecution) کا شکار بناتا تھا۔ جدید جمہوریت میں اِس کے برعکس، سیکولر پالیسی کو اختیار کیا گیا، یعنی مشترک مادی امور کو ریاست کے دائرے میں رکھنا اور مذہب اور کلچر کے معاملے میں لوگوں کو کامل آزادی عطا کرنا۔

ہر معاشرے کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ وہاں امن کا ماحول ہو۔ امن کے بغیر کسی بھی قسم کی کوئی ترقی نہیں ہوسکتی۔ سیکولرازم ایک عملی پالیسی کی حیثیت سے قیامِ امن کی یہی تدبیر ہے۔ اِسی تدبیر نے موجودہ زمانے میں ترقی یافتہ ملکوں کو قدیم طرز کی مذہبی لڑائیوں سے بچایا ہے۔ چناں چہ انڈیا سے لے کر امریکا اور برطانیہ تک سیکولر اسٹیٹ کے اصول کو اختیار کیا گیا۔ اِس کا مطلب مذہبی مخالفت نہیں، بلکہ مذہبی عدم مداخلت ہے۔ چناں چہ اِن ملکوں میں ہر مذہبی گروہ کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ اِن ملکوں میں جو چیز ممنوع ہے، وہ صرف تشدد ہے نہ کہ اپنے مذہب پر عمل۔

سیکولرازم کے معاملے میں جولوگ منفی ذہن رکھتے ہیں، اُس کا سبب یہ ہے کہ وہ دو چیزوں میں فرق نہیں کرتے۔ وہ سیکولر فلاسفی اور سیکولر پالیسی، دونوں کو ایک کرکے دیکھتے ہیں۔ حالاں کہ اِس معاملے میں درست رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھا جائے۔

سیکولرازم کے بارے میں منفی ذہن رکھنے والے لوگ ایک اور غلط فہمی کا شکار ہیں۔ وہ سیکولر پالیسی کو صرف مشترک مادی امور تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ وہ اس کو مذہبی مخالفت کے ہم معنیٰ سمجھ لیتے ہیں۔ حالاں کہ موجودزمانے میں سیکولر حکومت کا مطلب مخالفِ مذہب حکومت نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ حکومت مذہبی امور میں عدم مداخلت (non-interference) کی پالیسی کی پابند ہے۔ اِس معاملے میں ساری غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ ان لوگوں نے عدم مداخلت کو مخالفت کے ہم معنیٰ سمجھ لیا۔

اِس معاملے کا ایک پہلو اور ہے، وہ یہ کہ مذہبی آزادی کے اصول میں بیک وقت دو قسم کی آزادی شامل ہے — مذہبی عمل اور مذہبی تبلیغ۔ موجودہ زمانے کے تمام سیکولر ملکوں میں یہ دونوں قسم کی آزادی لوگوں کو مکمل طور پر ملی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مذہبی گروہ انفرادی طور پر اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوئے دوسرے مذہبی گروہوں کے درمیان اپنے مذہب کی پُرامن تبلیغ پوری طرح جاری رکھ سکتا ہے۔ یہ آزادی اِس حد تک حقیقی ہے کہ اِن ملکوں میں بہت سے لوگ اپنا مذہب بدل لیتے ہیں اور ان پر حکومت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی ہے۔ مثلاً حال میں انڈیا میں پست طبقے کے ایک لاکھ ہندوؤں نے بدھ ازم کو قبول کرلیا۔ اِسی طرح امریکا میں ہر سال تقریباً ایک لاکھ امریکی، اسلامی مذہب کو اختیار کرتے ہیں۔

اس اعتبار سے دیکھیے تو سیکولر پالیسی کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مذہبی گروہ بَر وقت انفرادی دائرے میں اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوئے یہ کوشش کرسکتا ہے کہ وہ دوسروں کے فکر اور عقیدے کو بدل سکے۔ یہ تبدیلی اگر بڑے پیمانے پر ہوجائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ آئندہ ملک کی اکثریت اپنے فکر اور عقیدے کو بدل لے۔ اِس طرح ایسا ہو کہ جو مذہبی فکر، حال میں انفرادی دین کی حیثیت رکھتا ہے، وہ مستقبل میں اجتماعی دین کا درجہ حاصل کرلے۔

فتویٰ کا غلط استعمال

ریاست جموں اور کشمیر میں اکثر، فوج اور تشدد پسندوں کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر تشدد پسند لوگ عموماً ایسا کرتے ہیں کہ وہ مذہبی عمارتوں میں داخل ہوکر وہاں پناہ لے لیتے ہیں اور وہاں سے اپنی کارروائیاں کرتے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں دونوں طرف سے گولیاں چلتی ہیں اور فطری طور پر مذہبی عمارت کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ صورتِ حال وادی کے مدرسے اور مسجد اور درگاہ، وغیرہ میں عرصے سے جاری ہے۔

ہندستانی فوج نے اِس صورتِ حال کے پیش نظر عرصے سے کشمیر میں 'سد بھاؤنا آپریشن' کے نام سے ایک مہم چلا رکھی ہے۔ اُن کے پاس گورنمنٹ آف انڈیا کا فنڈ ہوتا ہے۔ وہ لوگ اس کی مدد سے مسجد اور مدرسہ اور خانقاہ کی عمارتوں میں ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کرتے ہیں اور اُس کو پھر سے درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کام کشمیر میں کئی سالوں سے جاری ہے۔

جون 2007 میں سری نگر کے علاقہ راجوری کدَل میں علما کی ایک کانفرنس ہوئی۔ اِس میں کشمیری مسلمانوں کے مذہبی رہ نما 350 کی تعداد میں شریک ہوئے۔ یہاں انھوں نے فتویٰ یا بیان کی صورت میں متفقہ طور پر ایک ریزولوشن پاس کیا۔ اِس میں کہا گیا تھا کہ مسجد کی مرمّت غیر مسلموں کے ہاتھ سے کرنا، اسلام میں حرام ہے۔ اِس لیے سَد بھاؤنا آپریشن کا یہ کام دین میں مداخلت کی حیثیت رکھتا ہے، گورنمنٹ آف انڈیا کو چاہیے کہ وہ اِس کام کو فوراً بند کرے۔

یہ فتویٰ یا بیان سرتاسر بے بنیاد ہے، یہ اسلام کو اپنے سیاسی مقصد کے لیے استعمال کرنا ہے، اُس کا اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں، اور خود ہندستان میں ایسا برابر ہوتا رہا ہے کہ غیر مسلم لوگوں کے تعاون سے مسجدیں بنائی گئی ہیں یا اُن کی مرمّت کا کام ہوا ہے، مگر علما نے کبھی اِس کام کو غلط نہیں بتایا۔

اِس معاملے میں سب سے بڑی مثال خود کعبہ کی ہے، جو گویا کہ تمام مسجدوں کا نمائندہ ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، کعبہ یا بیت اللہ کو مکہ میں چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ساتویں صدی عیسوی کے رُبعِ اوّل میں ہوئی۔ اُس وقت وہاں کعبہ کی جو سنگی عمارت تھی، وہ ابراہیمی تعمیر کے مطابق نہ تھی۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کعبہ کی ابراہیمی عمارت بارش کی وجہ سے ڈھ گئی تھی۔ اُس وقت مکہ کے لوگوں نے کعبہ کی دوبارہ تعمیر کی۔ مکہ کے یہ لوگ مشرک اور بت پرست تھے۔ گویا کہ رسول اللہ کی بعثت کے وقت مکہ میں خانۂ کعبہ کی جو عمارت تھی، وہ مشرکین کے ہاتھوں بنائی گئی تھی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اُس پر اعتراض نہیں کیا، یہاں تک کہ ہجرت کے آٹھویں سال جب مکہ فتح ہو گیا اور رسول اللہ کو وہاں کا اختیار حاصل ہو گیا، تب بھی آپ نے ایسا نہیں کیا کہ آپ مشرکین کے بنائے ہوئے کعبہ کو ڈھائیں اور دوبارہ اس کو اہلِ ایمان کے ذریعے تعمیر کرائیں۔

تاریخ مزید بتاتی ہے کہ فتحِ مکہ کے وقت کعبہ کے اوپر جو غلاف تھا، وہ مشرکین کا بنایا ہوا تھا۔ اُس کو بنانے میں بت پرستوں کا مال استعمال ہوا تھا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر فتح حاصل کرنے کے باوجود اُس قدیم غلاف کو نہیں بدلا۔ بعد کو ایسا ہوا کہ ایک عورت کی غلطی سے یہ غلاف جل گیا۔ اِس کے بعد آپ نے نیا غلاف تیار کر کے اُس کے اوپر ڈالا۔ گویا کہ غلاف کی تبدیلی صرف اُس وقت کی گئی، جب کہ یہ تبدیلی ایک ناگزیر ضرورت بن گئی تھی۔

تاریخ میں اِس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جو واضح طور پر یہ بتاتے ہیں کہ مسجد یا مدرسے میں غیر مسلم کا تعاون لینا عین جائز ہے، اس میں کسی بھی قسم کا کوئی حرج نہیں۔ ایسے فعل کو دین میں مداخلت کہنا، سرتاسر غلط ہے، بلکہ وہ فتنہ انگیز ہے۔ کیوں کہ اِس سے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان تعلقات غیر ضروری طور پر بگڑ سکتے ہیں۔

کسی مسجد یا مدرسے کی بلڈنگ بذاتِ خود مسجد یا مدرسہ نہیں ہے، وہ صرف مسجد یا مدرسے کا ظاہری ڈھانچہ ہے۔ مسجد اصلاً عبادت کا مقام ہے، اِسی طرح مدرسہ اصلاً تعلیم کا مقام ہے۔ ظاہری

ڈھانچے کے بارے میں اِس قسم کے فتوے یا بیانات، اسلام کی روح کو سخت نقصان پہنچانے والے ہیں۔ اِس سے غیر ضروری طور پر ساری اہمیت ڈھانچے کی بن جاتی ہے۔ حالاں کہ صحیح یہ ہے کہ عبادت اور تعلیم کو اہمیت دی جائے۔ سارا زور اور تاکید بہتر عبادت اور بہتر تعلیم پر ہو۔ ڈھانچے کے بارے میں اِس قسم کی باتیں کرنا، لوگوں کے ذہن کو بگاڑنا ہے۔ اور ذہن کو بگاڑنا، اسلام میں ایک جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

اِس قسم کا منفی ذہن مسلمانوں کے اندر کیوں پیدا ہوا، اُس کا سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں نے موجودہ زمانے میں دعوت کا مزاج کھو دیا۔ دوسری اقوام ان کے لیے مدعو نہ رہیں، بلکہ وہ اُن کی حریف اور رقیب بن گئیں۔ اِسی منفی مزاج کا نتیجہ ہے جو کہ مذکورہ قسم کی نامحمود چیزوں کی صورت میں برآمد ہو رہا ہے۔

صحیح مسلم مزاج وہ ہے جس کو دعوتی مزاج کہا جاتا ہے۔ اِس کے مقابلے میں مسلمانوں کا جو موجودہ مزاج ہے، وہ قومی مزاج ہے نہ کہ دعوتی مزاج۔ دعوت، دوسرے انسانوں تک خدا کا ابدی پیغامِ رحمت پہنچانے کا نام ہے۔ اِس قسم کا مشن اپنے آپ داعی کو دوسرے انسانوں کا ہمدرد اور خیر خواہ بنا دیتا ہے۔ یہ مشن آدمی کے اندر دوسرے انسانوں کے لیے محبت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ یہ مشن آدمی کو دوسرے انسانوں کے حق میں نرم اور شفیق بنا دیتا ہے۔

قومی مزاج کا معاملہ اِس کے برعکس ہے۔ قومی مزاج آدمی کے اندر دوسروں کے خلاف رقیبانہ مزاج پیدا کر دیتا ہے۔ قومی مزاج ہمیشہ مادّی مفادات کی بنیاد پر بنتا ہے۔ اِس قسم کے مزاج میں دوسروں کے لیے شکایات ہوتی ہیں، نہ کہ ہمدردی اور خیر خواہی۔ آج کل مسلمانوں کے اندر عام طور پر یہی قومی مزاج بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کے بارے میں منفی نفسیات میں مبتلا ہو گیے ہیں۔ یہ منفی مزاج اُن کے تمام مسائل کا اصل سبب ہے۔

بدلتی ہوئی دنیا میں مسلمانوں کا لائحۂ عمل

5 اگست 2007 کی شام کو راقم الحروف نے ایک کشمیری اجتماع کو خطاب کیا۔ یہ ٹیلی فون پر ہونے والا ایک خطاب تھا۔ میں نے دہلی سے اپنے ٹیلی فون پر تقریر کی اور سری نگر میں اکھٹا ہونے والے کشمیری مسلمانوں نے اسپیکر ٹیلی فون پر اُس کو سنا۔ یہ خطاب کسی قدر اضافے کے ساتھ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مجھ سے اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے لیے لائحۂ عمل کیا ہے۔ میں کہوں گا کہ اُن کے لائحۂ عمل کا پہلا نکتہ ری اسیس مینٹ (re-assessment) ہے، یعنی ماضی میں اپنی کوششوں کا تنقیدی جائزہ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے اپنے ماضی میں جان و مال کی غیر معمولی قربانیاں دی ہیں۔ یہ قربانیاں اب تک جاری ہیں۔ ایسی حالت میں پہلا سوال یہ ہے کہ ان کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کہنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے مسلّح جدوجہد کے باوجود اپنے مقصد کو کسی بھی درجے میں نہیں پایا، بلکہ انھوں نے صرف اپنی تباہی میں مزید اضافہ کیا ہے۔

ایسی حالت میں موجودہ مسلمانوں کے لیے کرنے کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ جہاد کے نام پر کی جانے والی موجودہ مسلّح جدوجہد کو فوراً بند کردیں، تاکہ کم از کم ایسا ہو کہ وہ اپنے آپ کو مزید تباہی سے بچالیں۔ جہاد (بمعنیٰ قتال) کا مقصد اپنے آپ کو ہلاک کرنا نہیں ہے، بلکہ کسی مطلوب فائدے کو حاصل کرنا ہے۔ جب مطلوب فائدہ حاصل نہ ہو رہا ہو تو ٹکراؤ کی سیاست حرام کے درجے میں قابلِ ترک ہوجاتی ہے۔ یہی اب مسلمانوں کو کرنا چاہیے۔

میں جون 1989 میں سری نگر گیا تھا۔ وہاں میں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ اگر آپ شہر سے باہر جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ پہاڑ سے گھری ہوئی وادیوں میں ہر طرف پانی کے چشمے بہہ رہے ہیں۔ یہ چشمے آپ کو خدا کا ایک پیغام دے رہے ہیں۔ اِن چشموں کا حال یہ ہے کہ وہ مسلسل بہہ رہے

ہیں۔ اُن کے راستے میں بار بار پتھر آتے ہیں۔ یہ پتھر بظاہر چشمے کے لیے ایک رکاوٹ ہیں، لیکن چشمہ پتھروں سے نہیں ٹکراتا، بلکہ وہ ٹکراؤ کو اوائڈ کرتے ہوئے پتھر کے دائیں یا بائیں سے نکل جاتا ہے اور اِس طرح وہ اپنے سفر کو آگے کی طرف مسلسل جاری رکھتا ہے۔

میں نے کہا تھا کہ کشمیریوں کو اپنے قریب بہتے ہوئے چشموں سے سبق لینا چاہیے۔ انھوں نے انڈیا سے یا انڈیا کی آرمی سے غیر ضروری ٹکراؤ کا راستہ اختیار کیا ہے۔ یہ ٹکراؤ اُنھیں تباہی کے سوا کچھ اور دینے والا نہیں۔ میرا یہ انتباہ اب آخری طور پر درست ثابت ہو چکا ہے۔ اب کشمیری مسلمانوں کے لیے آخری طور پر وہ وقت آ گیا ہے جب کہ وہ ٹکراؤ یا مسلّح جدوجہد کا طریقہ مکمل طور پر چھوڑ دیں۔ وہ پُر امن میدان میں اپنی تعمیر کے کام میں لگ جائیں۔

آج کل نہ صرف کشمیر کے مسلمان، بلکہ ہر جگہ کے مسلمان ٹکراؤ کی سیاست کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ عملاً ٹکراؤ کی سیاست چلا رہے ہیں۔ جو لوگ ٹکراؤ کی سیاست میں عملاً شامل نہیں ہیں، وہ بھی اِسی انداز میں سوچتے ہیں۔ اُن کے پاس بھی سوچنے کا کوئی اور فریم ورک موجود نہیں۔

اِس معاملے پر غور کرنے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمان بدقسمتی سے اُس چیز سے محروم ہیں جس کو بصیرتِ زمانہ کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ ایک نیا زمانہ تھا۔ اب ہر چیز بدل چکی تھی۔ ایسی حالت میں ضروری تھا کہ سب سے پہلے زمانے کو سمجھا جائے اور پھر زمانے کی رعایت سے اپنے عمل کی نئی منصوبہ بندی کی جائے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ہمارے تمام رہ نما ردِّ عمل کی نفسیات کا شکار ہو گیے۔ انھوں نے ردّ عمل کے تحت، مفروضہ دشمنوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اِس قسم کی جنگ زمانے سے بے خبری کا نتیجہ تھی، اِس لیے وہ مکمل طور پر ناکام ہو کر رہ گئی۔

قدیم زمانے کو زرعی دَور کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں ہر جگہ بادشاہت کا رواج تھا۔ اِس نظام کے تحت سب سے زیادہ اہمیت پالٹکس کی ہو گئی تھی۔ اِس طرزِ فکر کے تحت لوگوں کے پاس سوچنے کا فریم ورک صرف ایک تھا، اور وہ تھا پولٹکل ایکٹوزم۔ موجودہ زمانے کے مسلم رہ نماؤں کا ذہن اِسی فکری تسلسل کے تحت بنا، چناں چہ جب موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے لیے مسائل پیدا

ہوئے تو انھوں نے اپنے متاثّر ذہن (conditioned mind) کے تحت، فوراً پولٹکل ایکٹوزم کا طریقہ اختیار کرلیا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں بصیرتِ زمانہ کی ضرورت تھی۔ ہمارے رہ نماؤں کو جاننا چاہیے تھا کہ اب پولٹکل ایکٹوزم کا دور ختم ہوگیا۔ اب مکمل معنوں میں پیس فُل ایکٹوزم کا زمانہ آچکا ہے۔ اب ایسے مواقع پیدا ہوچکے ہیں کہ پُرامن طریقِ کار کے ذریعے وہ سب کچھ مزید اضافے کے ساتھ حاصل کیا جاسکتا ہے جس کی امید پہلے صرف سیاسی جدوجہد سے کی جاسکتی تھی۔

موجودہ زمانے میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں، اُس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اُس نے مواقع (opportunities) کو ہر ایک کے لیے یکساں طور پر کھول دیا ہے۔ قدیم زمانے میں مواقعِ کار صرف اونچے طبقے کے کچھ لوگوں کو حاصل ہوتے تھے، اب مواقعِ کار عام انسانوں کی دست رس تک پہنچ گیے ہیں۔ پچھلا زمانہ ہر اعتبار سے محدودیت کا زمانہ تھا، اب جدید اسباب نے تمام حد بندیاں توڑ دی ہیں۔ اب ہر آدمی ہر کام کرنے کی پوزیشن میں ہوگیا ہے۔ پہلے زمانے میں علم کے نام سے آدمی بہت کم چیزوں کو جانتا تھا، اب علمی انفجار (knowledge explosion) کا زمانہ ہے۔ پہلے زمانے میں سیاسی طاقت سب سے بڑی طاقت سمجھی جاتی تھی، اب تعمیری اداروں اور غیر سیاسی تنظیموں نے سب سے بڑی طاقت کا درجہ حاصل کرلیا ہے، وغیرہ۔

موجودہ زمانے میں سیکولرازم نے حکومتوں کو پابند کردیا ہے کہ وہ لوگوں کے معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کریں۔ اب دنیا میں جمہوریت کا زمانہ ہے، جو عوام کی سیاسی حصے داری (power sharing) پر مبنی ہے۔ پہلے اقتصادیات کا تعلق صرف زراعت سے تھا، اب جدید صنعت نے اقتصادیات کو ہر ایک کی دست رس تک پہنچا دیا ہے۔ پہلے مذہبی جبر کا زمانہ تھا، اب دنیا میں مکمل طور پر مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ پہلے کوئی بڑا کام صرف بادشاہ کرسکتا تھا، اب اِداروں (institutions) اور غیر سیاسی تنظیموں کے ذریعے ہر کام کرنا ممکن ہوگیا ہے۔ پہلے زمانے میں صرف پولٹکل ایمپائر بن سکتا تھا، اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ غیر سیاسی سطح پر عالمی دعوہ ایمپائر بنایا جاسکے۔ پہلے یہ

سمجھا جاتا تھا کہ صرف تلوار میں طاقت ہے، اب پُرامن ذرائع کا دائرہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ آج تقریباً ہر چیز پُرامن ذرائع سے حاصل کی جاسکتی ہے، وغیرہ۔

اِن حالات میں متشددانہ طریقِ کار یا لڑائی کا طریقہ اختیار کرنا، ایک قسم کا خلافِ زمانہ عمل (anachronism) بن چکا ہے۔ جدید اصولوں کے مطابق، آدمی اگر تشدد نہ کرے تو وہ ہر کام کے لیے آزاد ہے۔ ایسی حالت میں اب تشدد کا طریقہ اختیار کرنا، ایک قسم کی دیوانگی ہے۔ کیوں کہ تشدد کا طریقہ اختیار کرتے ہی آدمی غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو محروم بنالیتا ہے۔ وہ اِس قابل نہیں رہتا کہ وہ جدید مواقع کار سے فائدہ اٹھائے اور اپنے مستقبل کی عظیم تعمیر کرے۔

یہاں یہ سوال ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے یہ تباہ کُن طریقہ کیوں اختیار کیا کہ انھوں نے سیاسی غلبے کو اپنا نشانہ بنالیا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت جلد انھوں نے جہاد کے نام سے متشددانہ طریقِ کار کو اختیار کرلیا اور آخر کار استشہاد (طلبِ شہادت) کے نام پر وہ خودکُش بم باری کی تباہ کُن حد تک پہنچ گیے۔

اِس بھیانک غلطی کا سبب موجودہ زمانے میں پیش کی جانے والی اسلام کی سیاسی تعبیر تھی۔ اسلام کی سیاسی تعبیر بلاشبہہ ایک بے بنیاد تعبیر تھی، لیکن موجودہ سیاسی حالات نے اِس تعبیر کو موافق فضا دے دی۔ اِس بنا پر بہت سے لوگ، خاص طور پر نوجوان طبقہ، اِس مغالطہ آمیز سیاسی تعبیر کے زیرِ اثر آ گیا اور اسلام کی عالمی حکومت قائم کرنے کے نام پر ایک پُرشور سیاسی تخریب کا عمل جاری کردیا۔

موجودہ زمانے میں جو انقلاب آیا، وہ عین خدا کی منشا کے مطابق تھا۔ وہ اِس لیے تھا کہ اہلِ اسلام، سیاسی نزاع اور متشددانہ ٹکراؤ سے بچ کر اسلامی دعوت کا ایک عالمی ایمپائر بنا سکیں۔ موجودہ زمانے میں ایسا کرنا عین ممکن بن چکا تھا، لیکن ٹکراؤ کی متشددانہ سیاست نے سارے امکانات کو تباہ کردیا۔

سیاسی اقتدار کی اصطلاحوں میں سوچنے کے بہت نقصانات ہوئے۔ اُن میں سے ایک نقصان یہ تھا کہ موجودہ زمانے کے کئی امکانات کو مسلم رہنما بالکل سمجھ نہ سکے۔ مثلاً موجودہ زمانے میں ایک جدید

ظاہرہ وہ پیدا ہوا، جس کو گلوبل ولیج اور گلوبلائزیشن کہا جاتا ہے۔ یہ ہمارے لیے ایک عظیم نعمت تھی۔ خصوصاً اسلامی دعوت کے لیے اُس نے عالمی مواقع کھول دیے، مگر بگڑے ہوئے ذہن کی بنا پر مسلم رہ نما اِس حقیقت کو سمجھ نہ سکے اور غیر ضروری طور پر وہ اُس کے مخالف بن گیے۔

اِسی منفی ذہن کی بنا پر موجودہ زمانے کے مسلم رہ نماؤں نے جگہ جگہ علاحدگی پسندی اور سپریشن کی تحریک چلا دی۔ آج کا زمانہ یونی ورسلائزیشن کا زمانہ تھا، مگر انھوں نے مسلمانوں کو محدودیت کے خول میں بند کرنے کی ناقابلِ فہم غلطی کا ارتکاب کیا۔ یہ اتنی بڑی غلطی تھی کہ اس کے بعد ان رہ نماؤں کا کوئی بھی کارنامہ اِس غلطی کی تلافی نہ کر سکا۔

خلاصہ یہ کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے لیے کسی موثر ملّی عمل کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ وہ یہ اعتراف کریں کہ انھوں نے ماضی میں غلط نشانہ بنایا۔ اِس غلطی کا کھُلا اعتراف کرنے کے بعد دوسرا کام یہ ہے کہ مسلمان موجودہ سیاسی ٹکراؤ اور جہاد کے نام پر مسلّح عمل کو مکمل طور پر ترک کر دیں۔ اُس کے بعد مسلمانوں کے لیے عمل کا جو نشانہ بنے گا، وہ دو نکاتی فارمولے پر مشتمل ہوگا— اپنی نئی نسلوں کو اعلیٰ تعلیم میں آگے بڑھانا، اور دعوہ ورک کو اپنا نشانہ قرار دینا۔ اِس کے سوا کوئی اور لائحۂ عمل، مسلمانوں کو اعلیٰ کامیابی تک پہنچانے والا نہیں۔

الرسالہ کے قارئین سے گذارش ہے کہ اسلام کے پیغام کو بے آمیز اور قابلِ فہم صورت میں ہر خاص و عام تک پہنچانے کی غرض سے اپنے اپنے علاقوں میں دار المطالعہ (study centre) قائم کریں۔ اس مقصد کے لیے الرسالہ اور مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتابیں (اردو اور انگریزی) نصف قیمت پر فراہم کی جائیں گی۔ اس سلسلے میں خط و کتابت کا پتہ یہ ہے:

Al-Risala Monthly
1 Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 24355454, 24355729, email: info@goodwordbooks.com
www.alrisala.org

نشانیوں سے سبق نہ لینا

قرآن کی سورہ نمبر بارہ کی ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں جن پر اُن کا گزر ہوتا رہتا ہے اور وہ اُن پر دھیان نہیں کرتے''۔ (یوسف: 105)

اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدا کی طرف سے مسلسل انسانی تاریخ میں ایسی نشانیاں ظاہر کی جارہی ہیں جو انسان کو اپنی محدودیت یاد دلائیں اور اُس کو اِس حقیقت کی طرف متوجہ کریں کہ وہ خدا کی رہ نمائی کے بغیر اپنے لیے کامیاب زندگی کی تعمیر نہیں کرسکتا، لیکن انسان غفلت کا شکار ہوکر اِن نشانیوں سے سبق نہیں لیتا اور اپنی محرومی کا خاتمہ نہیں کر پاتا۔

پچھلے پانچ ہزار سال سے دنیا کے تمام بڑے بڑے دماغ اِس میں مشغول تھے کہ وہ فلسفیانہ غور وفکر کے ذریعے سچائی کو دریافت کرلیں، لیکن لمبی کوشش کے بعد صرف یہ معلوم ہوا کہ فلسفے کا طریقہ کسی یقینی منزل تک پہنچانے کے لیے سراسر ناکافی ہے۔

جدید سائنس کے ظہور کے بعد انسان نے یہ سمجھا کہ سائنسی میتھڈ کے ذریعے وہ سچائی کو دریافت کرسکتا ہے، لیکن آخر کار صرف یہ معلوم ہوا کہ سائنسی میتھڈ آدمی کو صرف چیزوں کے علم (knowledge of things) تک پہنچا سکتا ہے، وہ آدمی کو سچائی کے علم (knowledge of truths) تک پہنچانے والا نہیں۔

ہزاروں سال سے انسان یہ سمجھتا تھا کہ روحانی طریقوں کے استعمال سے وہ سچائی تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ انسان کا دل تمام حقیقتوں کا خزانہ ہے۔ دل میں اپنے دھیان کو مرتکز کرکے سچائی کی دریافت کی جاسکتی ہے، لیکن آخر کار یہ ثابت ہوا کہ دل صرف گردشِ خون کا ذریعہ ہے، وہ حقائق ومعارف کا خزانہ نہیں۔

اِسی طرح جدید تہذیب کی ترقیوں کو دیکھ کر یہ امید قائم کرلی گئی تھی کہ تہذیب کا سفر آخر کار انسان کو اس کی مطلوب دنیا تک پہنچادے گا، لیکن حال میں گلوبل وارمنگ (Global Warming) کا مسئلہ ظاہر ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ موجودہ دنیا اب اپنے خاتمے کے قریب پہنچ گئی ہے، یہاں

مطلوبہ تہذیب کا قیام سرے سے ممکن ہی نہیں۔

اِس قسم کی نشانیاں، فطرت میں اور تاریخ میں، مسلسل ظاہر ہورہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالق نے موجودہ دنیا کے لیے جو مدت مقرر کی تھی، وہ مدت اب تمام ہوچکی ہے۔ اور وہ وقت آ گیا ہے کہ موجودہ دنیا کو ختم کر دیا جائے، تاکہ اس کے بجائے اگلی دنیا (world hereafter) شروع ہوسکے۔ قرآن کے یہ الفاظ شاید اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کررہے ہیں— ''جس دن ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے جس طرح طومار میں کاغذ لپیٹ دیے جاتے ہیں۔ جس طرح ہم نے تخلیق کی ابتدا کی تھی، اُسی طرح ہم پھر اُس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ہمارے ذمّے وعدہ ہے اور ہم اُس کو کرکے رہیں گے'' (الأنبیاء: 104)

اب آخری طور پر وہ وقت آ گیا ہے جب کہ انسان بیدار ہو۔ وہ فطرت میں اور تاریخ میں ظاہر ہونے والی نشانیوں سے سبق لے اور اپنی زندگی کی اِس طرح منصوبہ بندی کرے جو اگلے مرحلۂ حیات (post-death period) میں اُس کے کام آسکے۔ جو آدمی اِس موقع کو کھودے، اُس کو جاننا چاہیے کہ اُس کے لیے دوبارہ کوئی موقع آنے والا نہیں۔

انسان کو اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے صرف ایک ہی چانس دیا گیا ہے، یہ آدمی کے اوپر ہے کہ وہ اس کو استعمال کرتا ہے، یا اس کو ہمیشہ کے لیے کھو دیتا ہے۔ جو لوگ اِس چانس کو استعمال کرسکیں، ان کے لیے ابدی جنت ہے اور جو لوگ اِس چانس کو استعمال کرنے میں ناکام رہیں، ان کا انجام بائبل کے الفاظ میں یہ ہے— ایسے لوگ آگ کی بھٹی میں ڈال دیے جائیں گے اور وہاں ان کے لیے ابد تک رونا اور دانت پیسنا ہوگا:

> And will cast them into the furnace of fire. There will be wailing and gnashing of teeth. (Matthew 13: 42)

مسلم مسلک کیا ہے

مسلم مسلک کیا ہے۔ اِس سوال کے جواب میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنی دشمن قوموں کی سازش کا شکار ہیں، یہ اغیار کی سازش ہے جس نے مسلمانوں کو موجودہ زمانے میں مسائل سے دوچار کر رکھا ہے۔ یہ جواب، قرآن کی صراحت کے مطابق، یقینی طور پر بے بنیاد ہے۔ قرآن کی سورہ نمبر 3 میں ارشاد ہوا ہے کہ: **وإن تصبروا وتتقوا لا يضركم كيدُهم شيئًا** (آل عمران: 120) یعنی تم اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو دشمن کی سازش تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ صاحب مدارک التنزیل نے اِس آیت کی تشریح میں لکھا ہے: **هٰذا تعليمٌ من الله وإرشادٌ إلىٰ أن يُستعان علىٰ كيد العدوّ بالصبر والتقوىٰ**۔ (یہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم ہے اور اس کی ہدایت ہے کہ دشمن کی سازش کے مقابلے میں صبر اور تقویٰ سے مدد حاصل کی جائے)

اِس پر آپ غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ ایمان کے لیے جو مسئلہ ہے، وہ سازش کی موجودگی نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ صبر اور تقویٰ کی غیر موجودگی ہے۔ مذکورہ سوال کا یہ جواب قرآن کی براہِ راست نصّ سے ثابت ہے، اِس لیے اُس کے برحق ہونے پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔

اِس آیت میں مسئلۂ سازش کے حل کے طور پر دو لفظ کا ذِکر آیا ہے — صبر اور تقویٰ۔ صبر کا مطلب دراصل سیلف کنٹرول (self-control) ہے، یعنی پیش آمدہ صورتِ حال میں ردّعمل سے بچ کر اپنے اقدام کی مثبت منصوبہ بندی کرنا۔ کوئی صورتِ حال پیش آئے تو جذباتی تأثر کے تحت، جوابی کارروائی نہ کرنا بلکہ معاملے کے تمام مالہٗ وماعلیہ (موافق اور غیر موافق پہلو) کا اندازہ کر کے سوچا سمجھا اقدام کرنا۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں دوسرا لفظ جو استعمال ہوا ہے، وہ تقویٰ ہے۔ یہاں تقویٰ کا مطلب خود قرآن کی ایک اور آیت سے واضح ہو رہا ہے۔ دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: **ولا يجرمنكم شنآن قومٍ علىٰ أن لا تعدلوا، إعدلوا هو أقرب للتقوىٰ** (المائدۃ: 8) اِس آیت سے

معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ کا مطلب ہے— دشمنی کی حالت پیدا ہونے کے باوجود عدل پر قائم رہنا، اشتعال کی حالت میں بھی انصاف کی روش پر برقرار رہنا۔

قرآن کی اس آیت کی روشنی میں موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے کیس پر غور کیجیے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمان کسی بھی ملک میں اِس قرآنی معیار پر پورے نہیں اترتے۔ ہر جگہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ مخالفِ مزاج باتوں پر مشتعل ہوکر عاجلانہ اقدام کر بیٹھتے ہیں۔ وہ صرف انتقام کا فارمولا جانتے ہیں، عدل اور انصاف کا فارمولا اُنھیں معلوم ہی نہیں۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کے مسئلے کا حل صرف ایک ہے، اور وہ ہے اپنی پالیسیوں کے غلط ہونے کا اعتراف کرنا۔ دوسروں کو بُرا بتانے کے بجائے، خود اپنی کمزوریوں کو دریافت کرنا۔ اپنے سارے معاملے کا ری اسیس منٹ (reassessment) کرنا، اور پھر صبر اور تقویٰ کے اصول کی روشنی میں اپنے عمل کا نیا منصوبہ بنانا۔

میرے نزدیک، موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو تین نُکاتی فارمولے پر عمل کرنا چاہیے۔ اِس کے سوا اُن کے لیے کوئی بھی دوسرا لائحۂ عمل مفید نہیں ہوسکتا۔ وہ تین نکاتی فارمولا یہ ہے:

1- دوسروں کے خلاف منفی تقریر اور تحریر کو مکمل طور پر ترک کر دینا۔

2- پوری نسل کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کرنا۔

3- غیر مسلموں میں عالمی پیمانے پر اسلام کا مثبت تعارف۔

کوئی بھی بڑا کام صرف مثبت ذہن کے لوگ انجام دیتے ہیں۔ نکتۂ اول کی اہمیت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے اندر یہی مثبت ذہن پیدا کرتا ہے۔ موجودہ حالت میں مسلمانوں کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ تمام انسانیت کے لیے، دوست اور دشمن کی تفریق کے بغیر، خیر خواہ بن جائیں۔ ان کا نظریہ صرف اکرامِ مسلم نہ ہو، بلکہ ان کا نظریہ وسیع تر معنوں میں اکرامِ انسان ہو۔ ان کا برتاؤ ہر ایک کے لیے انسان فرینڈلی برتاؤ (insan-friendly behaviour) بن جائے، نہ کہ صرف مسلم فرینڈلی برتاؤ۔

حدیث میں مومن کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ: أن یکون بصیراً بزمانہ، یعنی بصیرتِ زمانہ

سے بہرہ وَر ہونا۔ تعلیم کا فائدہ یہی ہے۔ میرے نزدیک، تعلیم کا معیار یہ ہے کہ لوگ اپنی مادری زبان کے ساتھ عربی اور انگریزی زبانیں بھی بقدر ضرورت جانیں۔ تعلیم کا مقصد شعوری بیداری ہے، اور حقیقی معنوں میں شعوری بیداری کے لیے تین زبانوں کا جاننا ضروری ہے۔

دعوت الی اللہ کا مقصد صرف دعوت کا اعلان کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ غیر مسلموں کو یہ محسوس ہو کہ مسلمان، دنیا میں صرف لینے والے گروہ (taker group) نہیں ہیں، بلکہ وہ دینے والے گروہ (giver group) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس دنیا میں بڑی کامیابی صرف اُس کو ملتی ہے جو دوسرے کے لیے نافع بن جائے۔ شکایت اور احتجاج کا ذہن لے کر کوئی گروہ کبھی کوئی بڑی ترقی حاصل نہیں کرسکتا۔

الرسالہ آن لائن

اب آپ ماہ نامہ الرسالہ (اُردو اور انگریزی) کے نئے اور پرانے شمارے اور مولانا وحید الدین خاں کی کتابیں آن لائن بھی پڑھ سکتے ہیں اور اُس کو فری ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔ اس طرح اب آپ کے لیے ہر ماہ الرسالہ کے تازہ شماروں کا آن لائن مطالعہ ممکن ہو سکے گا۔

آن لائن مطالعے کے لیے ویب سائٹ کا پتہ درج ذیل ہے:

www.alrisala.org

مختلف فکری اور دعوتی موضوعات پر مولانا وحید الدین خاں کے ویڈیو اور آڈیو لیکچرز اُردو اور انگریزی زبان میں سننے کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

www.wkhan.net
www.alrisala.org